فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

سورۃ النساء آیت نمبر ۶۵

نصرۃ الحدیث

> ”جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا بس اتنا کہہ سکتا ہوں
> کہ میں ایسا جامع اور محقق نہیں لکھ سکتا“
>
> حکیم الامت حضرت تھانوی

تالیفات

محدث جلیل امیر الہند

حضرت مولانا ابو المآثر حبیب الرحمن الاعظمی

رحمہ اللہ تعالیٰ

ناشر
زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی

الحمدللّٰہ رب العلمین الصلوۃ والسلام علی سید
المرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین۔

انگریزی دور حکومت میں اسلام اور تعلیمات اسلام کے خلاف بہت سارے فتنے سامنے آئے اور ان کی شدت کا یہ حال تھا کہ مسلمانوں میں بھونچال کی صورت پیدا کردی ان فتنوں میں ایک بڑا فتنہ منکرین حدیث کا تھا، جو بڑی قوت سے یہ پروپیگنڈہ کررہے تھے کہ ہماری رہنمائی کے لئے قرآن کافی ہے، حدیث نبوی کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ حدیث کا عظیم الشان ذخیرہ قابل اعتماد نہیں ہے پھر اس موضوع پر بہت ساری کتابیں لکھی گئیں اور مسلمانوں میں پھیلائی گئیں اور کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ جو جدید علم سے گو آراستہ تھا مگر کتاب وسنت کی تعلیم سے قطعاً بے بہرہ تھا اس گمراہ فرقہ کے دھوکہ میں آنے لگا تھا۔

اس وقت ضرورت محسوس ہوئی کہ منکرین حدیث کے غلط پروپیگنڈے کی تردید کی جائے اور حجیت حدیث پر قلم اٹھایا جائے اور عام مسلمان خصوصاً اہل علم طبقہ کو اس گمراہی سے بچایا جائے اس نازک موقع پر والد محترم امیر الہند محدث کبیر حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی شیخ الحدیث مدرسہ مرقاۃ العلوم مئو نے ''نصرۃ الحدیث'' کے نام سے ایک محققانہ کتاب تصنیف فرمائی جو طبقہ علماء میں کافی مقبول ہوئی، اس وقت کے سب سے بڑے عالم دین حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے پڑھ کر تحریر فرمایا تھا کہ آپ نے عظیم خدمت انجام دی ہے، اور شاید ایسی تحقیقی کتاب کوئی دوسرا عالم نہیں لکھ سکتا تھا، خدمت حدیث کا آپ نے پورا حق ادا کردیا ہے اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے۔

چنانچہ پہلی دفعہ یہ کتاب (نصرۃ الحدیث) ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور منکرین حدیث کے پھیلے ہوئے فتنہ پر آہنی دیوار ثابت ہوئی اور اس کا زور ٹوٹنے لگا اس وقت اس کے مسلسل دو ایڈیشن شائع ہوئے، حدیث کی حجیت اور اہمیت وفضیلت پر بہت مؤثر ثابت ہوئی اس کتاب کے مطالعہ سے بہت سارے مسلمانوں نے انکار حدیث نبوی سے توبہ کیا اور منکرین حدیث کی کتابوں سے جو تذبذب اور شکوک وشبہات ان کے دلوں میں پیدا ہو چکے تھے اس دلدل سے صحت وسلامتی کے ساتھ نکل آئے اور حدیث نبوی کی صحت اور اس کی ضرورت پر ایمان و یقین پختہ ہوگیا۔

ادھر عرصہ دراز سے اس کا ایڈیشن ختم تھا بعض اہم علم کا تقاضا تھا کہ اسے پھر سے چھپوایا جائے تاکہ مسلمانوں کا نوجوان طبقہ اس کتاب کو پڑھے اور وہ کسی گمراہ کرنے والے کے دھوکہ وفریب میں نہ آنے پائے اس کتاب کی اہمیت وضرورت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس کی کتابت شروع کردی اب وہ طبع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے، خدا کرے جدید تعلیم یافتہ حضرات اور دوسرے عوام و خواص مسلمان اس کا مطالعہ کریں تاکہ آئندہ زندگی میں وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو سکیں۔ دعا ہے کہ رب العالمین ہماری اس علمی دینی اور اصلاحی خدمت کو قبول فرمائے، اور مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کا موقع عنایت فرمائے۔

رشید احمد الاعظمی

* * *

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ طبع ثانی

حامداً و مصلیاً

آج سے چھ برس پہلے میں نے مولانا بہاء الحق قاسمی (امرت سری) کی فرمائش پر منکرین حدیث کے رد میں نصرۃ الحدیث لکھی تھی، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اس نے اس حقیر رسالہ کو بڑی مقبولیت بخشی، چنانچہ اس کا پہلا ایڈیشن جو مولانا بہاء الحق موصوف کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا، چند ہی دنوں میں ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔

اس وقت سے علم دوست حضرات کا اس کے دوسرے ایڈیشن کے لئے سخت تقاضا تھا۔ مولانا محمد ایوب صاحب ناظم مدرسہ مفتاح العلوم کو یہ تقاضے زیادہ سننے پڑتے تھے، اس لئے ان کو اس کی اشاعت کی زیادہ فکر تھی لیکن ان کا خیال تھا کہ اس پر ایک مقدمہ کا اضافہ ہو جائے جس میں محدثین کے حافظہ وغیرہ پر مبسوط تبصرہ ہو تو رسالہ کی افادی حیثیت کو چار چاند لگ جائیں۔ اس لئے وہ کئی سال سے مقدمہ لکھنے کا بہت اصرار سے تقاضا کر رہے تھے، اور اسی انتظار میں رسالہ کو پریس کے حوالہ نہیں کرتے تھے مجھ کو ان کی اس رائے سے بدیں لحاظ اتفاق تھا کہ اگر مقدمہ لکھنے کی نوبت آئی تو اس میں بہت سی وہ باتیں بھی پیش کر سکوں گا، جن کو اصل رسالہ میں لکھنے کی ضرورت تھی، مگر تطویل کے اندیشے سے وہاں قصداً نظر انداز کرنی پڑیں۔

بایں ہمہ دوسرے کاموں سے میں اتنی فرصت نہیں پاتا تھا کہ مقدمہ لکھ سکوں اب چونکہ فرصت کا انتظار کرتے کرتے کئی سال گزر گئے، اور رسالہ کی دوبارہ اشاعت میں بہت زیادہ تاخیر ہوگئی، اس لئے مجبوراً سر دست دوسرے کاموں کو پیچھے ڈال کر مقدمہ لکھنا شروع کر رہا تھا۔ "واللہ ولی التوفیق۔"

فتنہ انکار حدیث

ہندوستان میں انکار حدیث کی بدعت بظاہر تو عبداللہ چکڑالوی نے (پنجاب میں) ایجاد کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ چکڑالوی سے بہت پہلے اس فتنہ کا بیج نیچری فرقہ نے بویا تھا، عبداللہ چکڑالوی نے آکر اس شجرۂ ملعونہ کی آبیاری کی اور اسی کے ہاتھوں وہ بڑھا، اور پھولا پھلا اس لئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس فتنہ کا بانی وہی ہے۔

نیز نیچری فرقہ اپنے اس عقیدہ کا صاف لفظوں اور زیادہ گھناونے انداز میں اظہار نہیں کرتا تھا، چکڑالوی نے بے حجاب ہوکر اپنے کفریات کی اشاعت اور حد سے زیادہ ایمان سوز و اسلام کش پیرایۂ بیان اختیار کیا، اس لئے انکار حدیث کی لعنت اسی کی طرف منسوب کی گئی۔

انکار حدیث کا محرک وسبب

بہرحال اس فتنہ کا بانی جو بھی ہو، اس کا اصلی محرک تو جیسا کہ میں نصرۃ الحدیث میں بتا چکا ہوں لادینی و آزادہ روی ہے، مگر اپنی لادینی پر پردہ ڈالنے اور انکار حدیث کے عقیدہ میں زبردستی معقولیت پیدا کرنے کے لئے منکرین حدیث کہا اور لکھا کرتے ہیں کہ۔

> ”حدیثیں آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد دوسو برس بعد معرض تحریر میں آئی ہیں۔“[1]

چغتائی کا منشاء یہ ہے کہ ”جب دوسو برس تک حدیثیں لکھی نہیں گئیں، صرف یاد داشت اور زبانی روایت پر دارومدار رہا، تو اس طویل مدت میں یادداشت کی کمزوری اور نقل درنقل کی وجہ سے حدیثوں کے الفاظ اور ان کے مضامین ومعانی کیا سے کیا ہو

---

[1] دیکھو عظیم بیگ چغتائی کا رسالہ تعریض

گئے ہوں گے، اس حالت میں حدیثوں پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔"

چغتائی صاحب کا یہ تخیل اپنی جگہ پر چاہے کتنا ہی غلط اور بے بنیاد ہوتا ہم غنیمت ہے کہ وہ سرے سے حدیثوں کا انکار نہیں کرتے، لیکن حق گو جو نصرۃ الحدیث میں ہمارے اصلی مخاطب ہیں، ان کی اپج تو یہ ہے کہ:

"یقینی بات ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانے سے قبل تک لوگ حدیثوں کو نہ جانتے تھے، یعنی "حق گو" کے خیال فاسد میں آنحضرت ﷺ کا کوئی قول وفعل صحابہ نے کسی سے بیان ہی نہیں کیا، اور حدیثوں کا سرے سے کہیں وجود ہی نہ تھا، وہ تو عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں اور ان کے بعد لوگوں نے اپنی طرف سے حدیثیں بنالیں۔"

"حق گو" کے اس تخیل فاسد کا رد تو میں نصرۃ الحدیث (صفحہ ۷۱ تا ۷۹) اور (۲۰۱ تا صفحہ ۲۰۸) میں نہایت وضاحت سے اتنے زوردار طریقہ پر کر چکا ہوں کہ کسی منصف مزاج کے لئے مجال گفتگو باقی نہیں رکھی ہے۔

رہا چغتائی صاحب کا تخیل تو گو اس کا غلط اور بے سروپا ہونا بھی واضح ہے، اور نصرۃ الحدیث میں جگہ جگہ اس کا غلط ہونا بھی ثابت کیا جا چکا ہے، نیز جریدۂ ضیاء الاسلام (امرت سر) جلد اول نمبر ۱۲ میں اس مقالے کے سلسلے میں جو میرے ایک شاگرد کے نام سے شائع ہوا ہے، اس پر کافی بحث ہو چکی ہے، بایں ہمہ اس پر کچھ شرح و بسط سے کلام کرنے کی اس لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے، کہ عربی سے ناواقف اور بالخصوص تاریخ حدیث سے نابلد طبقہ عموماً اس غلط فہمی میں مبتلا ہے۔

چغتائی صاحب نے مذکورہ بالا تخیل میں گویا دو دعوی کئے ہیں۔

① آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد دو سو برس تک حدیثوں کا قید کتابت میں نہ آنا۔

② صرف یادداشت پر دارومدار رہنے کی وجہ سے حدیثوں کا کچھ سے کچھ ہو جانا

.... اب آیئے ہم ان کے دونوں دعووں کو پرکھیں اور دیکھیں کہ ان میں کتنی

صداقت ہے۔

کتابت حدیث کی تاریخ

چغتائی صاحب کا پہلا دعویٰ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد دو سو برس تک حدیثیں صرف زبانی رہیں، لیکن جب ہم تاریخ و سیر کا مطالعہ کرتے ہیں بلکہ تاریخ سے بھی زیادہ مستند بیانات پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کی کتابت آنحضرت ﷺ کی زندگی ہی میں شروع ہو چکی تھی۔

عہد نبوی میں حدیث کی کتابت

چنانچہ صحیح بخاری (جلد۱ صفحہ۲۲) میں حضرت ابو ہریرہ ؓ کا بیان ہے کہ صحابہ میں عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ کے سوا کسی اور کے پاس مجھ سے زیادہ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں نہیں ہیں، حضرت عبداللہ کے پاس اتنی زیادہ حدیثیں اس وجہ سے ہیں کہ وہ لکھا کرتے تھے، اور میں لکھتا نہ تھا، مسند احمد، اور طحاوی (جلد۲ صفحہ۳۸۴)، اور مجمع الزوائد (جلد۱ صفحہ۱۵۱) میں حضرت ابو ہریرہ ؓ کا بیان ہے کہ عبداللہ بن عمرو ؓ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اور دل سے یاد بھی کرتے تھے اور میں صرف دل سے یاد کرتا تھا، لکھتا نہ تھا۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے لکھنے کی اجازت لی تھی، اور آنحضرت ﷺ نے ان کو اجازت دے دی تھی، مجمع الزوائد (جلد۱ صفحہ۱۵۱) میں حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت سے مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ علم کو مقید کرو۔ حضرت عبداللہ نے پوچھا کہ علم کا مقید کرنا کیا ہے۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ لکھنا، سنن ابوداؤد (جلد۲ صفحہ۷۷) اور دارمی (صفحہ۶۸) میں خود حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ کا بیان ہے کہ میں جتنی باتیں[1] آنحضرت ﷺ کی زبان سے

---

[1] فقرہ کنت اکتب کل شئ اسمع "یعنی میں ہر بات جو آنحضرت ﷺ سے سنتا تھا لکھ لیا کرتا تھا" خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام حدیثیں لکھتے تھے۔ ۱۲ منہ

سنتا تھا یاد رکھنے کے لئے ان کو قلم بند کر لیتا تھا، قریش نے مجھ کو اس سے منع کیا کہ آنحضرت ﷺ بشر ہیں، اور بہت سی باتیں غصہ کی حالت میں بھی فرما جاتے ہوں گے اس لئے حدیثیں نہ لکھو، میں ان کے کہنے سے رک گیا، اور آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم لکھو اور اپنے دہان مبارک کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے فرمایا کہ اس سے کسی حالت میں ناحق اور غلط بات نہیں نکلتی۔ ان بیانات کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی زندگی ہی میں آپ کی تمام حدیثیں آپ کے حکم و اجازت سے لکھتے جاتے تھے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کتابت حدیث کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس کو انہوں نے برابر جاری رکھا، تا آنکہ ان کے پاس احادیث کا ایک دفتر تیار ہو گیا تھا اور اس کا نام انہوں نے صادقہ رکھا تھا۔ اس دفتر احادیث سے ان کو ایسا عشق تھا کہ کسی حالت میں بھی اس کی مفارقت ان کو گوارا نہ تھی، فرماتے تھے "ما یرغبنی فی الحیوٰۃ الا الصادقۃ" یعنی مجھ کو زندگی کا خواہش مند یہی کتاب (صادقہ) بنا رہی ہے، یہ نہ ہو تو مجھے جینے کی خواہش نہیں ہے، پھر خود ہی صادقہ کا تعارف ان الفاظ میں کراتے تھے، "اما الصادقۃ فصحیفۃ کتبتھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" یعنی صادقہ ایک صحیفہ (دفتر) ہے جس کو میں نے آنحضرت ﷺ سے سن سن کر لکھا ہے۔[1]

"یہ دفتر کتنا ضخیم ہوگا اور اس میں کتنی زیادہ حدیثیں ہوں گی، اس کا اندازہ لگانے کے لئے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا یہ بیان کافی ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے ایک ہزار (صرف) امثال یاد کئے ہیں۔"[2]

تہذیب التہذیب (صفحہ ۵) میں ابن معین کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی چند کتابیں ان کے پوتے شعیب کو ملی تھیں، شعیب ان میں کی حدیثوں

---

[1] دارمی: ص ٦٨ [2] عینی: ١/ ١٨

کی روایت کیا کرتے تھے میں کہتا ہوں کہ حدیث کی کتابوں میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے جتنی حدیثیں مذکور ہیں وہ سب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے اسی صحیفے کی حدیثیں ہیں، جیسا کہ تہذیب التہذیب (ترجمہ عمرو) میں متعدد محدثین نے اس کی تصریح کی ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو کا یہ صحیفہ شعیب کے بعد ان کے بیٹے عمرو کے ہاتھ لگا تھا، اور وہ اس کو اپنے باپ کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں۔

عہد نبوی میں متعدد صحابہ کا حدیث لکھنا

یہ خیال بھی نہ کرنا چاہیے کہ عہد نبوی میں تنہا حضرت عبداللہ بن عمرو حدیثیں لکھتے تھے، اس لیے کہ سنن دارمی (صفحہ ۶۸) میں خود انہی کا بیان ہے کہ ایک دن ہم آنحضرت ﷺ کے گرد بیٹھے ہوئے حدیثیں لکھ رہے تھے، اسی اثناء میں کسی نے پوچھا کہ قسطنطنیہ پہلے فتح ہوگا یا رومہ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ نہیں ہرقل کا شہر پہلے فتح ہوگا، اس روایت میں "بینما نحن حول رسول اللّٰہ (صلی اللّٰہ علیہ وسلم نکتب)" کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ ان کے ساتھ ایک جماعت لکھ رہی تھی، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ہی کے ایک دوسرے بیان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب انہوں نے حدیث لکھنا شروع نہیں کیا تھا اس وقت بھی کئی صحابی لکھا کرتے تھے، ان کا وہ بیان مجمع الزوائد (جلد۲ صفحہ ۵۲) میں یوں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں چند صحابی بیٹھے ہوئے تھے میں بھی ان کے ساتھ حاضر تھا، آنحضرت ﷺ نے اس وقت ارشاد فرمایا کہ جو آدمی مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ جب ہم وہاں سے اٹھے تو میں نے ان صحابیوں سے کہا کہ یہ وعید سننے کے بعد آپ لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی حدیث بیان کرنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ تو ان صحابہ نے فرمایا کہ بھتیجے! ہم نے آنحضرت ﷺ سے جو کچھ سنا ہے وہ سب ہمارے پاس لکھا ہوا ہے۔

اسی طرح دوسرے مستند بیانات سے بھی متعدد صحابہ کا حدیثیں لکھتے رہنا ثابت ہے۔ چنانچہ مجمع الزوائد (جلد۱ صفحہ۱۵۱) میں بحوالہ طبرانی حضرت رافع بن خدیج (صحابی) کا بیان مذکور ہے کہ ہم نے خدمت نبوی میں یہ گزارش کی کہ ”یا رسول اللہ انا نسمع منك اشياء فنكتبها قال اكتبوا ولا حرج“ یعنی یا رسول اللہ ہم آپ کی زبان سے بہت سی چیزیں سنتے ہیں اور اس کو لکھ لیتے ہیں تو اس کی نسبت کیا حکم ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ لکھتے رہو اس میں کوئی حرج نہیں ہے حضرت رافع کے اس بیان سے بھی معلوم ہوا کہ متعدد اشخاص کا دستور تھا کہ حدیثیں سن کر لکھ لیتے تھے۔ ترمذی (جلد۲ صفحہ۹۱) اور مجمع الزائد (جلد۱ صفحہ۲۵۱) میں حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ ایک انصاری صحابی نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی کہ مجھ کو حدیثیں یاد نہیں رہتیں تو آپ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے مدد لو یعنی لکھ لیا کرو۔

مجمع الزوائد (جلد۱ صفحہ۲۵۱) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حدیثوں کے یاد نہ رہنے کی شکایت کی، تو آپ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے مدد لو، کنز العمال (جلد۵ صفحہ۲۲۶) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما و حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہاتھ سے کام لینے (یعنی لکھنے) کا حکم دیا۔

عہد نبوی کی کتاب الصدقہ

ابوداؤد (جلد۱ صفحہ۱۵۶) اور ترمذی (جلد۱ صفحہ۷۹) میں حضرت عبداللہ بن عمر کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے عاملوں کے پاس بھیجنے کے لئے ایک کتاب الصدقہ لکھوائی تھی جس میں جانوروں کی زکوٰۃ سے متعلق حدیثیں تھیں، لیکن ابھی اس کو عاملوں کے پاس بھیجنے کی نوبت نہیں آئی تھی، کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کا سانحہ پیش آگیا، جب حضرت ابوبکر آپ ﷺ کے

جانشیں ہوئے تو انہوں نے اس پر عمل کیا۔

عہد نبوی کا ایک اور نوشتہ

ترمذی (جلد۱ صفحہ ۳۰۶)، اور نسائی (جلد۲ صفحہ ۱۹۱) میں عبداللہ بن حکیم کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں آپ کا ایک نوشتۂ مبارک ہمارے (قبیلہ جہینہ کے) پاس پہنچا، جس میں یہ حدیث بھی تھی کہ مردار جانور کی (بے پکائی ہوئی) کھال اور پٹھے کو کام میں نہ لاؤ۔

فتح مکہ کا خطبہ

صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے دن ایک طویل خطبہ دیا جس میں بہت سی حدیثیں ارشاد فرمائیں، جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو حضرت ابوشاہ یمنی نے درخواست کی کہ میرے لئے یہ خطبہ لکھوا دیا جائے، حضرت نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی اور حکم دیا کہ ان کو خطبہ لکھ کر دے دیا جائے۔

کتاب عمرو بن حزم

طحاوی (جلد۲ صفحہ ۲۱۷)، اور نسائی وغیرہما میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک نوشتہ لکھوا کر عمرو بن حزم کے ہاتھ اہل یمن کے پاس بھیجا تھا اس نوشتہ میں فرائض وسنن اور خون بہا کے مسائل تھے، اس نوشتہ کے جستہ جستہ فقرے حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں، مستدرک حاکم (جلد۱ صفحہ ۳۹۵) لغایت (صفحہ ۳۹۷) میں اس نوشتہ سے ترسٹھ حدیثیں نقل کی ہیں۔ اہل یمن کے نام ایک نوشتہ نبوی کا ذکر امام شعبی نے بھی کیا ہے، اور اس نوشتہ کی کئی حدیثیں امام شعبی کی روایت سے مصنف ابن ابی شیبہ (صفحہ ۱۰ زکوٰۃ و صفحہ ۱۲ زکوٰۃ) میں منقول ہیں۔

صحیفہ حضرت علی ؓ

عہد نبوی کے نوشتوں میں سے ایک حضرت علی کا صحیفہ بھی تھا جس میں خود حضرت علی کے بیان کے مطابق خون بہا اور اسیروں کی رہائی کے مسائل تھے اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ کوئی مسلمان کافر (حربی) کے بدلہ میں نہ مارا جائے۔[1] اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ مدینہ کی سرزمین عیر سے ثور تک حرم (بہت زیادہ قابل احترام) ہے لہٰذا جو شخص اس میں کوئی بدعت نکالے، یا کسی بدعتی کو پناہ دے اس پر تمام انسانوں اور فرشتوں کی لعنت ہے، اللہ تعالیٰ اس کی کوئی فرض یا نفل عبادت قبول نہ کرے گا۔[2] اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ جو شخص غیر خدا کی تعظیم و خوشنودی کے لئے جانور ذبح کرے اس پر اللہ کی لعنت اور اس پر بھی اللہ کی لعنت جو اپنے باپ پر لعنت کرے اور اس پر بھی اللہ کی لعنت جو کسی بدعتی کو پناہ دے اور اس پر اللہ کی لعنت جو زمین کا نشان مٹائے۔[3]

اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ سب مسلمانوں کا خون برابر ہے، اور یہ کہ ایک معمولی مسلمان نے ذمہ لے لیا تو اس کا پاس ولحاظ سب مسلمانوں پر ضروری ہے اگر کوئی شخص کسی مسلمان کا ذمہ توڑے گا تو اس پر خدا اور سارے فرشتوں اور انسانوں کی لعنت، اور یہ بھی تھا کہ جو شخص اپنے مولی کے سوا دوسرے کو مولی بنائے اس پر بھی سب کی لعنت۔[4]

اور اس میں زکوۃ کے مسائل بھی تھے۔[5]

عہد نبوی میں کتابت حدیث کے یہ چند واقعات سرسری طور پر میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیئے ہیں، تلاش وجستجو کرنے والے کو اور واقعات بھی مل سکتے ہیں۔

---

[1] بخاری: ۲۱/۱
[2] بخاری: ۲۵۱/۱ و مسلم
[3] مسلم: ۱۶۱/۲
[4] بخاری: ۲۵۱/۱
[5] بخاری ۴۳۸/۱ نیز مسند احمد و طحاوی: ۳۰۴/۲

عہد صحابہ میں حدیث کی کتابت

اس کے بعد عہد صحابہ کی تاریخ پڑھئے اس عہد میں بھی آپ کو کتابت حدیث کے بے شمار واقعات ملیں گے، تمثیل کے طور پر چند واقعات اس عہد کے بھی نقل کئے جاتے ہیں۔

① اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت صدیق اکبر کا واقعہ سنئے مورخ اسلام حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ (صفحہ ۵) میں اور شیخ علی متقی نے کنز العمال (جلد ۵ صفحہ ۲۳۷) میں امام حاکم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے آنحضرت ﷺ کی حدیثیں جمع کرنا شروع کی تھیں، پانچ سو حدیثیں لکھ چکے تھے کہ ایک دن اس مجموعہ کو منگا کر آگ میں ڈال دیا اور فرمایا کہ اس میں میں نے دو حدیثیں بھی لکھی تھیں، جن کو براہ راست آنحضرت ﷺ سے میں نے نہیں سنا تھا۔ بلکہ کسی اور کی زبانی سنا تھا، ممکن ہے کہ اس نے مجھ سے جس طرح بیان کیا ہے، اس طرح آنحضرت ﷺ نے نہ فرمایا ہو۔ کسی اور طرح فرمایا ہو تو خواہ مخواہ میری گردن پر اس کا بوجھ ہوگا۔

② دارمی (صفحہ ۶۸) و مستدرک حاکم (جلد ۱ صفحہ ۱۰۶) میں امیر المومنین فاروق اعظم کا یہ فرمان منقول ہے کہ علم کو کتاب میں مقید کرلو۔

③ دارمی و مستدرک میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ علم کو لکھ کر مقید کرو۔ نیز صحیح مسلم (جلد ۱ صفحہ ۴۶) میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ (صحابی) کی زبانی حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث سنی تو اپنے لڑکے سے کہا کہ اس کو لکھ لو۔ چنانچہ انہوں نے لکھ لیا۔ طحاوی (جلد ۲ صفحہ ۳۸۴) میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کا اپنے لڑکے سے حدیث لکھوانا مذکور ہے۔

④ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (المتوفی ۵۸ھ) کی نسبت اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ وہ

عہد نبوی میں حدیثوں کو لکھا نہ کرتے تھے، لیکن بعد میں انہوں نے بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر یا کسی دوسرے سے لکھوا کر اپنی حدیثوں کو سفینہ میں محفوظ کر لیا تھا، چنانچہ فتح الباری (جلد۱ صفحہ۱۴۸) میں حسن ابن عمرو کا بیان ہے کہ حضرت ابوہریرہ ؓ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے، اور حدیث نبوی کی کئی کتابیں دکھا کر فرمایا کہ دیکھو یہ میرے پاس لکھی ہوئی موجود ہیں۔

اور بشیر بن نہیک کا بیان طحاوی (جلد۲ صفحہ۳۸۵) میں ہے کہ میں حضرت ابوہریرہ ؓ سے حدیث کی کتابیں عاریت لے کر نقل کرتا تھا، نقل سے فارغ ہو کر ان کو کل سناتا جاتا تھا، سنانے کے بعد عرض کرتا تھا کہ میں نے آپ کو جو سنایا ہے وہ سب آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ ہاں۔

❺ حضرت ابن عباس (المتوفی ۶۸ھ) کے بھی چند صحیفے تھے، جن میں حدیثیں قلم بند تھیں، چنانچہ ترمذی (جلد۲ صفحہ۲۳۸) اور طحاوی (جلد۲ صفحہ۳۸۴) میں ہے کہ طائف کے کچھ لوگ حضرت ابن عباس ؓ کے پاس ان کے چند صحیفے لے کر حاضر ہوئے کہ آپ ہم کو یہ سنادیں، اس وقت حضرت ابن عباس ؓ کی نگاہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ پڑھ نہ سکے اور فرمایا تم خود سنادو، تمہارا سنانا اور میرا پڑھنا جواز روایت کے حق میں دونوں برابر ہیں۔

❻ ابوداؤ (جلد۲ صفحہ۱۸) میں ابوالبختری کا بیان ہے کہ میں نے ایک صحابی یا تابعی سے حدیث سنی، اور مجھ کو بہت بھلی معلوم ہوئی، تو میں نے ان سے درخواست کی کہ اس کو میرے لئے لکھ دیجئے، چنانچہ انہوں نے لکھ کر میرے حوالہ کیا۔

❼ دارمی (صفحہ۶۸) میں ہے کہ ابان (تابعی) حضرت انس ؓ کے پاس بیٹھے ہوئے ساگون کی تختیوں پر حدیثیں لکھتے رہتے تھے۔

❽ طحاوی (جلد۲ صفحہ۳۸۴) میں عبداللہ بن محمد بن عقیل کا بیان ہے کہ ہم لوگ حضرت جابر ؓ (المتوفی ۷۸ھ) کی خدمت میں حاضر ہو کر آنحضرت ﷺ کی

حدیثوں کو پوچھتے تھے، اور لکھ لیتے تھے۔

⑨ داری (صفحہ ۶۹) میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ (المتوفی ۷۳ھ) نے فرمایا کہ علم کو قید تحریر میں لاؤ چنانچہ داری ہی میں حضرت سعید بن جبیر کا بیان ہے کہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے حدیثیں سنتا تھا تو لکھ لیتا تھا۔

⑩ داری (صفحہ ۶۹) اور طحاوی (جلد ۲ صفحہ ۳۸۴) میں ہے کہ حضرت سعید بن جبیر وغیرہ حضرت ابن عباس کے پاس حدیثیں لکھتے رہتے تھے، بلکہ داری میں یہ بھی ہے کہ کاغذ بھر جاتا تھا تو کسی دوسری ہی چیز پر لکھ لیتے تھے۔

⑪ داری (صفحہ ۶۹) میں ہے کہ عنترہ کو بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حدیث لکھنے کی اجازت دی۔

⑫ داری (صفحہ ۶۹) میں عبداللہ بن حنش کا بیان ہے، کہ میں نے حضرت براء رضی اللہ عنہ (المتوفی ۷۲ھ) کی مجلس میں لوگوں کو ہتھیلیوں پر بھی حدیث لکھتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ناچیز کہتا ہے کہ کاغذ بھر جاتا ہوگا، تو ہتھیلیوں پر اس لئے لکھ لیتے ہوں گے کہ گھر پہنچ کر کاغذ پر نقل کر لیں گے۔

⑬ داری میں ہے کہ حسن بن جابر نے حضرت ابوامامہ (المتوفی ۸۶ھ) باہلی سے حدیث لکھنے کی بابت دریافت کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

⑭ مجمع الزوائد (جلد ۱ صفحہ ۱۵۱) میں ابو بردہ اشعری کا بیان مذکور ہے۔ کہ میں اپنے والد (حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ) سے حدیثیں سنتا تھا تو لکھ لیا کرتا تھا ایک دن میرے والد نے میرا مجموعہ منگوا کر مجھ سے پڑھوایا میں پڑھ چکا تو فرمایا کہ ہاں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح سنا ہے لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کچھ کمی بیشی نہ ہو جائے۔

عہد تابعین میں کتابت حدیث

اوپر جو واقعات آپ نے پڑھے ہیں، ان میں صحابہ کے سامنے یا صحابہ سے سن

کہ حدیث لکھنے کا ذکر ہے، اب چند ایسے واقعات سنئے جن میں تابعین کے سامنے یا تابعین سے سن کر حدیث لکھنے کا تذکرہ ہے۔

❶ ترمذی (جلد۲ صفحہ ۲۳۸) اور دارمی (صفحہ ۶۶) میں ابراہیم نخعی کا بیان ہے کہ سالم ابن ابی الجعد حدیثیں لکھا کرتے تھے، سالم کی وفات ۱۰۱ھ میں ہوئی ہے اور انہوں نے بعض صحابہ سے بھی حدیثیں سنی ہیں۔

❷ تذکرۃ الحفاظ (جلد۱ صفحہ ۱۰۳) میں ابوالزناد (تابعی) کا بیان ہے کہ ہم زہری کے ساتھ علماء کے پاس حدیثیں سننے کے لئے جاتے تھے، زہری اپنے ساتھ تختیاں اور کاغذ لئے رہتے تھے، اور جتنا سنتے سب لکھتے رہتے تھے، زہری کی وفات ۱۲۴ھ میں ہوئی ہے۔

❸ کنز العمال (جلد۵ صفحہ ۲۳۸) میں صالح بن کیسان (تابعی) کا بیان ہے کہ طلب علم کے زمانہ میں میرا اور زہری کا ساتھ تھا، زہری نے مجھ سے کہا آؤ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں لکھیں، چنانچہ ہم دونوں نے حدیثیں لکھیں۔

❹ دارمی (صفحہ ۶۹) میں ہشام ابن الغاز کا بیان منقول ہے کہ عطاء بن ابی رباح تابعی سے لوگ پوچھتے جاتے تھے اور انہی کے سامنے لکھتے جاتے تھے، عطاء ابن ابی رباح کی وفات ۱۱۴ھ میں ہوئی۔

❺ دارمی میں (صفحہ ۶۹) میں رجاء بن حیوۃ (المتوفی ۱۱۲ھ) کا بیان ہے کہ ہشام ابن عبدالملک نے اپنے عامل کو مجھ سے ایک حدیث دریافت کرنے کے لئے لکھا، اگر وہ حدیث میرے پاس لکھی ہوئی نہ ہوتی تو میں اس کو بھول ہی چکا تھا۔

❻ دارمی (صفحہ ۶۹) میں سلیمان بن موسیٰ کا بیان ہے کہ میں نے نافع (تابعی) کو دیکھا ہے کہ وہ حدیثیں اپنی زبان سے بولتے جاتے ہیں اور لوگ ان کے سامنے لکھتے جاتے ہیں، نافع کا انتقال ۱۱۷ھ میں ہوا۔

❼ ترمذی (جلد۲ صفحہ ۲۳۹) میں ہے کہ ایک شخص حسن بصری کے پاس آیا اور کہا

کہ میرے پاس آپ کی بیان کردہ کچھ حدیثیں لکھی ہوئی ہیں میں ان کی روایت آپ سے کرسکتا ہوں؟ تو انہوں نے کہا کہ ہاں، تہذیب التہذیب میں ہے کہ حمید طویل نے حسن بصری کی کتابیں نقل کی تھیں۔[1] حسن بصری کی وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی۔

❽ ترمذی (جلد۲ صفحہ ۲۳۹) میں ابن جریج کا بیان ہے کہ میں ہشام بن عروہ کے پاس ایک کتاب لے کر پہنچا اور کہا یہ آپ کی روایتیں ہیں ان کو میں بیان کروں؟ تو انہوں نے کہا، ہاں ہشام بن عروہ کی وفات ۱۴۶ھ میں ہوئی۔

❾ تذکرۃ الحفاظ (جلد۱ صفحہ ۸۸) میں ہے کہ ابوقلابہ وفات کے وقت اپنی کتابوں کی وصیت ایوب سختیانی کے لئے کر گئے تھے چنانچہ وہ کتابیں شام سے اونٹ پر بار کر کے لائی گئیں، ایوب فرماتے ہیں کہ میں نے بارہ چودہ درم ان کا کرایہ ادا کیا ابوقلابہ کی وفات ۱۰۴ھ میں ہوئی۔

❿ صحیح بخاری جلد۱ فتح الباری (جلد۱ صفحہ ۱۴۰) اسعاف المبطا (صفحہ ۵) دارمی (صفحہ ۶۸) میں ہے کہ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تمام اطراف سلطنت میں یہ فرمان بھیجا کہ آنحضرت ﷺ کی حدیثوں کو جمع کرو چنانچہ ابوبکر بن حزم (جو ان کی طرف سے مدینہ کے امیر و قاضی تھے) کے پاس جب یہ فرمان پہنچا تو انہوں نے حدیث کے کئی مجموعے تیار کیے، مگر ابھی ان کو دربار خلافت میں بھیجنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ عمر بن عبدالعزیز کی وفات ہوگئی، نیز عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے ابن شہاب زہری نے بھی حدیثوں کو مدون کیا تھا، تذکرۃ الحفاظ (جلد۱ صفحہ ۱۰۶) میں معمر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زہری کی حدیثوں کے دفتر کئی اونٹوں پر بار کیے گئے تھے، عمر بن عبدالعزیز کی وفات ۱۰۱ھ میں ہوئی ہے۔

عہد تابعین کے یہ چند واقعات برسبیل تذکرہ میں نے پیش کئے ہیں، اور ہر واقعہ کے ساتھ صاحب واقعہ کا سن وفات بھی لکھ دیا ہے سنین وفات دیکھ کر آپ معلوم

---

[1] تہذیب التہذیب: ۳/۳۹

کر سکتے ہیں کہ یہ واقعات وفات نبوی سے صرف سو برس بعد کے ہیں بلکہ اکثر تو سو برس کے اندر ہی کے ہیں۔

تبع تابعین کے عہد میں حدیث کی کتابت

اب ذرا اور قریب آیئے اور تبع تابعین کا دور نظر کے سامنے رکھئے تو اور زیادہ کتابت احادیث کے واقعات آپ کی نگاہ سے گزریں گے، اور حدیثوں کے دفتر کے دفتر آپ کو دکھائی دیں گے جو اس عہد میں لکھے گئے، اور ان میں سے بعض بعض آج بھی ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں۔ اس دور میں حدیثوں کے لکھنے کا یہ دستور تو باقی ہی تھا، کہ استاذ سے جو حدیثیں سنیں، لکھ لیں، چنانچہ محمد بن بشیر کا بیان ہے کہ مسعر (المتوفی ۱۵۵ھ) کے پاس ایک ہزار حدیثیں تھیں، میں نے دس کے سوا ساری لکھ لیں۔[1]

عبدالرزاق کا بیان ہے کہ میں نے معمر المتوفی ۱۵۳ھ سے دس ہزار حدیثیں سن کر لکھی ہیں۔[2]

حماد بن سلمہ کے پاس قیس بن سعد کی کتاب تھی۔[3] ثوری یمن گئے تو ان کو ایک تیز لکھنے والے کاتب کی ضرورت ہوئی، ہشام ابن یوسف کا بیان ہے کہ لوگوں نے مجھ کو پیش کیا، چنانچہ میں ان کے لئے حدیثیں لکھا کرتا تھا۔[4]

ابونعیم کا بیان ہے کہ میں نے آٹھ سو مشائخ سے حدیثیں لکھی ہیں، شعیب بن حمزہ نے بہت زیادہ حدیثیں لکھی تھیں، زہری بولتے اور شعیب لکھتے تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے شعیب کی کتابیں دیکھی تھیں ان کا بیان ہے کہ شعیب کی کتابیں بہت صحیح اور درست تھیں، شعیب کی وفات ۱۶۳ھ میں ہوئی۔[5]

ابوعوانہ پڑھنا جانتے تھے، لکھنا نہیں جانتے تھے، اس لئے جب حدیث سنتے

---

[1] تذکرہ: ص ۱۷۷

[2] تذکرہ: ۱/۱۷۵

[3] تذکرہ: ۱/۱۹۸

[4] تذکرہ: ۱/۲۶۶

[5] تذکرہ: ۱/۲۱۰

کے لئے جاتے تو دوسرے سے لکھواتے تھے ابوعوانہ کی وفات ۱۶۳ھ میں ہوئی۔[1]

ابن لہیعہ کے پاس بھی حدیث کی کتابیں تھیں، چنانچہ ابن صالح کا بیان ہے کہ میں نے عمارہ بن غزیہ کی حدیثیں ابن لہیعہ ہی کی اصل سے نقل کی ہیں، ابن لہیعہ نے ۱۷۴ھ میں انتقال کیا۔[2]

سلیمان ابن بلال المتوفی ۱۷۲ھ کے مسموعات کی بھی کئی کتابیں تھیں اور اپنے مرنے کے وقت وصیت کر گئے تھے کہ وہ کتابیں عبدالعزیز بن حازم کو دی جائیں۔[3]

ابوحاتم رازی کا بیان ہے کہ ابونعیم نے عبدالسلام بن حرب سے کئی ہزار حدیثیں سن کر لکھیں، عبدالسلام کی وفات ۱۸۷ھ میں ہوئی۔[4]

ابن المبارک نے اپنی لکھی ہوئی جن حدیثوں کی روایت کی، اور لوگوں کو سنایا ان کی تعداد بیس ہزار تھی۔[5]

غندر کے پاس بھی ان کی مسموعات کی کتابیں تھیں، ابن معین کا بیان ہے کہ ان کی کتابیں سب سے زیادہ صحیح تھیں۔

ابن مہدی کا بیان ہے کہ ہم شعبہ کی زندگی ہی میں غندر کی کتابوں سے فائدہ اٹھاتے تھے، غندر کی وفات ۱۹۳ھ میں ہوئی۔[6]

بہرحال کتابت حدیث کے اس دستور کے علاوہ باقاعدہ تصنیف کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا، چنانچہ مکہ معظمہ میں ابن جریج المتوفی ۱۵۰ھ نے، یمن میں معمر بن راشد المتوفی ۱۵۳ھ نے، بصرہ میں سعید بن ابی عروبہ المتوفی ۱۵۶ھ اور ربیع بن صبیح المتوفی ۱۶۰ھ نے حدیث کی کتابیں تصنیف کیں، اور اسی عہد میں موسیٰ بن عقبہ المتوفی ۱۴۱ھ اور ابن اسحاق المتوفی ۱۵۱ھ نے غزوات وسیرت نبوی پر کتابیں لکھیں۔

اور ان کے بعد امام اوزاعی المتوفی ۱۵۷ھ نے شام میں امام ابن المبارک

---

[1] تذکرہ: ۲۱۹/۱ [2] تذکرہ: ۲۲۰/۱ [3] تذکرہ: ۲۴۷/۱

[4] تذکرہ: ۲۲۹/۱ [5] تذکرہ: ۲۵۹/۱ [6] تذکرہ: ۱۳۷/۱

المتوفی ۱۸۱ھ نے خراسان میں حماد بن سلمہ المتوفی ۱۶۷ھ نے بصرہ میں سفیان ثوری المتوفی ۱۶۱ھ نے کوفہ میں جریر بن عبدالحمید المتوفی ۱۸۸ھ نے رے میں، اور ہشیم المتوفی ۱۸۳ھ نے واسط میں حدیث کی کتابیں لکھیں۔

اور تقریباً اسی زمانہ میں امام مالک نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب موطا تصنیف فرمائی، امام مالک نے ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔

اسی زمانہ میں ابو معشر سندی نے غزوات نبوی پر کتاب لکھی ابو معشر نے ۱۷۰ھ میں وفات پائی۔

ان حضرات کے بعد ابراہیم بن محمد اسلمی استاذ شافعی نے امام مالک کی موطا کے طرز پر اپنی موطا لکھی جس کی نسبت ابن عدی کا بیان ہے کہ موطائے مالک سے وہ چندگونہ بڑی تھی، ابراہیم کی وفات ۱۸۴ھ میں ہوئی۔[1]

یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ کوفی شاگرد امام اعظم بھی صاحب تصنیف تھے، یحییٰ کا انتقال ۱۸۲ھ میں ہوا۔[2]

معافی بن عمران موصلی المتوفی ۱۸۵ھ نے کتاب السنن، کتاب الزہد، کتاب الادب، کتاب الفتن وغیرہ تصنیف کی۔[3]

عبدالرحیم بن سلیمان کنانی نے بھی کئی کتابیں لکھیں۔[4]

امام ابو یوسف المتوفی ۱۸۲ھ نے کتاب الآثار، کتاب الخراج وغیرہ لکھیں، اور امام محمد المتوفی ۱۸۹ھ نے موطا کتاب الآثار، کتاب الحج وغیرہ تصنیف فرمائیں، ولید بن مسلم المتوفی ۱۹۵ھ نے حدیث کے مختلف ابواب وموضوعات پر ستر کتابیں لکھیں۔[5]

امام وکیع بھی فن حدیث میں صاحب تصنیفات تھے ۱۹۷ھ میں ان کی وفات

---

[1] تذکرہ
[2] تذکرہ ۱/۲۴۶
[3] تذکرہ ۱/۲۶۵
[4] تہذیب ۶/۲۰۶
[5] تذکرہ ۱/۲۷۹

ہوئی۔[1]

ابن وہب المتوفی ۱۹۷ھ نے اہوال القیامۃ اور جامع وغیرہ تصنیف کیں، نیز ایک بہت ضخیم موطا بھی ان کی تصنیفات میں ہے۔

محمد بن فضیل المتوفی ۱۹۵ھ نے کتاب الزہد، کتاب الدعاء، وغیرہ اپنی یادگار چھوڑی۔ اس دور کی تصنیفات میں سے سفیان کی جامع، ابن المبارک کی کتاب الزہد والرقاق، امام مالک کی موطا، ابو یوسف کی کتاب الآثار، اور کتاب الخراج اور امام محمد کی موطا، کتاب الآثار اور کتاب الحج وغیرہ آج بھی موجود ہیں۔

چغتائی کا دوسرا دعویٰ

چغتائی کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ دو سو برس تک صرف زبانی روایت پر دارومدار رہنے کی وجہ سے حدیثیں کچھ سے کچھ ہوگئیں، اگرچہ پہلے دعویٰ کا غلط اور بے سروپا ہونا ثابت کردینے کے بعد اس دوسرے دعویٰ پر کچھ لکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی اس لئے کہ یہ دعویٰ تمام تر پہلے ہی دعویٰ پر مبنی ہے اور اس کا غلط ہونا ثابت ہوچکا، تو اب اس کے غلط ہونے میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے۔ تاہم تبرعاً اس پر کلام کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اگرچہ اوپر تاریخی شواہد سے ثابت ہوچکا ہے کہ صرف زبانی روایت پر کسی زمانے میں بھی دارومدار نہیں رہا ہے بلکہ عہد نبوی ہی سے کتابت حدیث کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے لیکن اگر بالفرض یہ سلسلہ نہ رہا ہوتا تو بھی عہد نبوی سے لے کر پچھلے ہر دور میں حدیثوں کو سینے میں محفوظ رہنے کا جو بلیغ اہتمام تھا اور اس کے ادا، وبیان کرنے میں جو کامل احتیاط مدنظر تھا، اس کے پیش نظر یہ دعویٰ کرنا ممکن ہی نہیں کہ زبانی روایت پر دارومدار رہنے کی وجہ سے حدیثیں کچھ سے کچھ ہوگئیں۔

---

[1] تذکرہ ۱/۲۸۳

حفظ حدیث کا اہتمام بلیغ

عہد نبوی ﷺ

عہد نبوی میں حدیثوں کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ اہتمام تھا کہ صحابہ حدیثوں کا دور کیا کرتے تھے، چنانچہ حضرت انس ؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے حدیثیں سنتے رہتے تھے، جب آپ مجلس سے اٹھ جاتے تو ہم آپس میں حدیثوں کا دور کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک آدمی کل حدیثیں بیان کر جاتا پھر دوسرا، پھر تیسرا، بسا اوقات ساٹھ ساٹھ آدمی مجلس میں ہوتے تھے اور وہ ساٹھوں باری باری سے بیان کرتے تھے، اس کے بعد جب ہم اٹھتے تھے تو حدیثیں اس طرح ذہن نشین ہوتی تھیں کہ گویا ہمارے دلوں میں بوئی گئی ہیں۔[1]

حضرت معاویہ ؓ کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں فرض نمازوں کے بعد مسجد میں صحابہ کرام بیٹھ جاتے، اور قرآن پاک اور احادیث نبویہ کا مذاکرہ کرتے تھے۔[2]

حضرت ابو سعید خدری ؓ کا بیان ہے کہ صحابہ کرام جب کہیں بیٹھتے تھے تو ان کی گفتگو کا موضوع فقہ یعنی آنحضرت ﷺ کی حدیثیں ہوتی تھیں یا پھر یہ کہ کوئی آدمی قرآن پاک کی کوئی سورۃ پڑھے یا کسی سے پڑھنے کو کہے۔[3]

دور کرنے کے علاوہ انفرادی طور پر بھی حدیثوں کو ازبر کرنے کا بڑا اہتمام تھا، اور جن کو باوجود کوشش کرنے کے حدیثیں یاد نہ ہوتی تھیں وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی شکایت کرتے تھے اور پوچھتے تھے کہ حدیثوں کو محفوظ رکھنے کی کیا تدبیر کریں جیسا کہ حضرت ابوہریرہ ؓ اور حضرت انس ؓ کے بیان

---

[1] مجمع الزوائد: ۱/۱۶۱ [2] مستدرک: ۱/۹۴ [3] مستدرک: ص ۹۴

سے اوپر (زیر عنوان عہد نبوی میں حدیث کی کتابت) معلوم ہو چکا ہے، نیز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ بیان بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ میں حدیثوں کو صرف دل سے یاد کرتا تھا اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ از بر کرنے کے ساتھ ساتھ لکھتے بھی تھے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان مسلم (جلد۱صفحہ۱۰)، ابن ماجہ (صفحہ۴) وغیرہ میں ہے۔ "کنا نحفظ الحدیث" یعنی ہم حدیثیں یاد کیا کرتے تھے۔ اس قسم کے مزید واقعات نقل کر کے بات کو طول دینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، صرف ایک بات لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کو نہایت تاکیدی حکم تھا کہ جو لوگ میری مجلس میں حاضر ہوں وہ غیر حاضروں کو میری حدیثیں ضرور پہنچا دیں۔[1] نیز ان لوگوں کے حق میں تر و تازگی و سرسبزی کی دعا فرمائی تھی، جو آپ کی حدیثوں کو سن کر خوب اچھی طرح یاد کرلیں اور پھر اس کو بجنسہٖ دوسروں کو تک پہنچا دیں۔

"نضر الله عبدا سمع مقالتی (وفی روایة) حدیثنا (کما فی الدرای صفحه٤٢) فحفظها ووعاهاواداها (وفی روایة) فبلغه (دارمی صفحه٤٢) کما سمع۔"[2]

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ اس بندہ کو سرسبز (خوش) رکھے جو میری کوئی حدیث سن کر یاد کرلے اور خوب سمجھ لے پھر اس کو جس طرح سنا ہے اسی طرح دوسرے کو پہنچا دے۔"[3]

---

[1] بعض دوسری روایتوں میں حدیثوں کی روایت کرنے والوں کو اپنا جانشین فرمایا ہے۔ (کنز العمال: ۲۲۲/۵)، ایک دوسری حدیث میں اس شخص کو جنت کی بشارت دی ہے، جو امت کے لئے چالیس حدیثیں محفوظ کرلے۔ (بخاری: ۱۶/۱)

[2] مشکوٰۃ ص ۲۷ بحوالہ احمد ترمذی ابوداؤد ابن ماجہ، دارمی

[3] اس مضمون کو تقریباً انہی الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ابن مسعود و عائشہ، زید بن ثابت، جبیر بن مطعم، انس، ابوہریرہ، عمیر بن قتادہ، سعد بن ابی وقاص، ابن عمر، معاذ بن جبل، نعمان بن بشیر، جابر اور زید بن خالد رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے۔ (کنز العمال: ۲۲۰/۵، ۲۲۱، ۲۲۲)

صحابہ کے حالات سے جو لوگ باخبر ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے اس حکم کی تعمیل اور اس دعا میں اپنے کو شامل کرنے کے لئے انہوں نے ہرگز کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ہوگا۔

عہد صحابہ رضی اللہ عنہم

عہد صحابہ میں بھی حدیثوں کو ازبر کرنے کا بیش از بیش اہتمام تھا، حضرات صحابہ اپنے شاگردوں کو یاد کرنے کی برابر تاکید کرتے رہتے تھے، اور محفوظ رکھنے کی تدبیر بھی بتایا کرتے تھے۔

❶ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے۔

"تذاكروا هذا الحديث لا ينفلت منكم."[1]

ترجمہ: "حدیثوں کا آپس میں مذاکرہ (دور) کیا کرو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔"

❷ یہ بھی فرمایا کرتے تھے۔

"ردوا الحديث واستذكروه فانه ان لم تذكروه ذهب."[2]

ترجمہ: "حدیث کو (بار بار پڑھ کر) دہرایا کرو اور اس کو مستحضر کرو اگر اس طرح یاد نہ کروگے، تو جاتی رہے گی۔"

❸ ان یہ کی تاکید بھی تھی کہ ہر روز کچھ حدیثیں بیان کیا کریں فرماتے تھے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ابھی تو کل بیان کیا ہے، لہٰذا آج نہ بیان کروں گا نہیں آج بھی بیان کرو اور پھر کل (آئندہ) بھی بیان کرنا۔

❹ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بھی آپس میں حدیث کے مذاکرہ کی تاکید کیا کرتے تھے۔[3] بلکہ وہ اس باب میں اتنے سخت تھے کہ شاگرد اگر درخواست کرتے کہ حدیثیں لکھوا دیجئے تو انکار کر دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ جس طرح ہم نے

---

[1] دارمی، ص ۷۸ [2] دارمی: ص ۷۸ [3] دارمی: ص ۷۷ و مستدرک: ۹۴/۱

آنحضرت ﷺ سے حدیثوں کو سن کر حفظ کیا ہے تم بھی حفظ کرو۔[1]

۵ حضرت علی مرتضیٰ ؓ اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے۔

"تذاکروا الحدیث فانکم الا تفعلوا یندرس"[2]

ترجمہ: "حدیثوں کو باہم یاد کیا کرو اس لئے کہ ایسا نہ کرو گے تو حدیث مٹ جائے گی۔"

۶ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کی سخت تاکید تھی کہ۔

"تذاکروا الحدیث فان ذکر الحدیث حیاته"[3]

ترجمہ: "حدیثوں کا مذاکرہ کرتے رہو کہ یہی اس کے بقا کا سامان ہے۔"

۷ حضرت علی ؓ کا ارشاد ہے:

"تزاوروا وتدار سوا الحدیث ولا تترکوه یندرس"[4]

ترجمہ: "ایک دوسرے سے ملتے رہو اور باہم حدیث کا مذاکرہ کرتے رہو اس کو چھوڑ نہ دو کہ فنا ہو جائے۔"

صحابہ کرام کے شاگرد اپنے اساتذہ کے ان احکام کا پورا احترام کرتے تھے، اور حدیثوں کے مذاکرہ سے کبھی غافل نہیں رہے، چنانچہ دارمی (صفحہ ۷۹) اور تذکرہ (صفحہ ۱۱۹) میں عطاء کا بیان ہے کہ جب ہم حضرت جابر ؓ کے پاس سے حدیثیں سن کر اٹھتے تھے تو باہم مذاکرہ کرتے تھے ہمارے ہم سبقوں میں ابوزبیر کا حافظہ سب سے اچھا تھا، ان کو سب سے زیادہ حدیثیں یاد ہوتی تھیں۔

مستدرک (جلد ۱ صفحہ ۹۴) ابن بریدہ کا بیان ہے کہ ہم مسجد میں نماز کے بعد بیٹھ جاتے اور احادیث نبویہ کا مذاکرہ کرتے۔

---

[1] دارمی: ص ٦٦ [2] مستدرک: ۱/۹۵

[3] مستدرک ۱/۹۶، دارمی ص ۷۹ [4] دارمی، ص ۷۹، کنز العمال، ۵/۲۴۲

دارمی (صفحہ ۷۹) میں ہے کہ زہری عشاء کی نماز کے بعد حدیث کا مذاکرہ کرنے بیٹھے تو صبح تک یہ مشغلہ جاری رہا، دارمی میں یہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگردوں سے پوچھا کہ تم لوگ آپس میں ملتے رہتے ہو، اور کہیں ایک جگہ بیٹھ کر حدیث کا مذاکرہ بھی کرتے ہو؟ شاگردوں نے جواب دیا کہ ہم کو تو اس کا اتنا اہتمام ہے کہ ہمارا کوئی ساتھی کبھی غائب ہو جاتا ہے، تو اگر وہ کوفہ کے آخری سرے پر بھی ملتا ہے تو وہیں جا کر اس سے ملتے ہیں۔[1]

عہد تابعین رحمۃ اللہ علیہم

صحابہ کے بعد تابعین کا دور آیا تو وہ بھی اپنے شاگردوں کو حدیثوں کو حفظ کرنے کے لئے، دور اور مذاکرہ کی ہدایتیں کرتے رہے، چنانچہ دارمی میں عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ زہری اور علقمہ کے وہ ہدایات قریب قریب صحابہ کے مذکورہ بالا الفاظ میں منقول ہیں۔

انہی تاکیدوں کا نتیجہ تھا کہ حارث بن یزید عکلی، قعقاع بن یزید مغیرہ اور فضیل ء کی نماز کے بعد مذاکرہ کرنے کے لئے بیٹھتے تو صبح ہی کو یہ مجلس برخاست ہوتی۔[2]

یونس کا بیان ہے کہ جب ہم حسن بصری کے پاس سے حدیثیں سن کر اٹھتے تھے، تو آپس میں اس کا دور اور مذاکرہ کرتے تھے۔[3]

اسماعیل بن رجاء کا دستور تھا کہ کوئی نہ ملتا تو مکتب کے لڑکوں کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے حدیثیں بیان کرتے تاکہ حدیث کی مشق میں ناغہ نہ ہو، اور بھولنے نہ پائیں۔[4]

حفظ حدیث کے لئے صحابہ و تابعین اور اتباع تابعین کا یہ غیر معمولی اہتمام آپ

---

[1] دارمی: ص ۷۹

[2] دارمی: ص ۷۸، تہذیب: ۱۰/۲۷۰

[3] دارمی: ص ۷۸

[4] دارمی: ص ۷۸، تہذیب التہذیب: ۱/۲۹۶

نے ملاحظہ کیا، اس کے ساتھ اس تاریخی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ قدرت کی طرف سے ان حضرات کو کس قدر حیرت انگیز قوت یادداشت اور غیر معمولی حافظے عطا ہوئے تھے جس کی نظیر آج مشکل سے دستیاب ہوسکتی ہے، پس ان حالات اور واقعات کے باوجود یہ خیال قائم کرلینا کہ زبانی روایت پر دارومدار ہونے کی وجہ سے حدیثیں کچھ سے کچھ ہوگئیں، انصاف کا خون یا تاریخی حقائق سے چشم پوشی اور نری وہم پرستی ہے۔

صحابہ وتابعین کا غیر معمولی حافظہ

میں نے ابھی ابھی صحابہ وتابعین کی حیرت انگیز قوت یادداشت کا جو ذکر کیا ہے وہ محض خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ واقعات کی روشنی میں پوری ذمہ داری کے ساتھ میں نے اس بات کو لکھا ہے۔

اسماء رجال اور تذکرہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں پر تو میرے اس بیان کی صداقت آفتاب کی طرح روشن ہے، لیکن جن کو یہ موقع نہیں ملا ہے، ان کے اطمینان وتشفی کے لئے چند تاریخی واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔

① صحابہ میں حضرت ابوہریرہ ؓ کا نام کون نہیں جانتا، مورخ اسلام حافظ ذہبی کی کتاب تذکرۃ الحفاظ میں خود انہی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ تم مال غنیمت سے حصہ نہیں مانگتے، میں نے عرض کیا کہ میں آپ سے علم کی دولت مانگتا ہوں، اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے میری چادر میرے جسم سے اتار کر بیچ میں پھیلا دی، اور حدیثیں بیان کرنا شروع کیں، فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ چادر کو اپنے سینے سے ملالو، میں نے ایسا ہی کیا اس کے بعد سے میرا یہ حال ہوگیا ہے کہ ایک حرف بھی آپ کی حدیث کا مجھ کو نہیں بھولتا تھا۔[1]

② تابعین میں ایک مشہور ومعروف مفسر اور حافظ حدیث قتادہ ہیں، ان کی نسبت

---

[1] تذکرہ: ۲۲/۱

امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ قتادہ جو کچھ سن لیتے ان کو یاد ہو جاتا تھا، ان کے سامنے ایک دفعہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا صحیفہ (یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کی ہوئی حدیثوں کا مجموعہ) صرف ایک دفعہ پڑھ دیا گیا، ان کو کل یاد ہو گیا، خود قتادہ کا بیان ہے کہ میں نے کبھی کسی استاذ سے دہرانے کی خواہش نہیں کی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی چیز میرے کان میں پڑے اور وہ میرے دل میں بیٹھ نہ جائے۔[1]

③ ایک نہایت جلیل القدر تابعی امام شعبی ہیں وہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے واقعات بیان کر رہے تھے اتفاق سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (صحابی) کا ادھر سے گزر ہوا اور انہوں نے شعبی کا بیان کرنا سنا تو فرمایا کہ باوجودیکہ میں ان غزوات میں خود شریک تھا لیکن شعبی کو مجھ سے زیادہ واقعات یاد ہیں اور وہ مجھ سے زیادہ باخبر ہیں۔[2]

شعبی خود کہتے تھے کہ میں نے کبھی کوئی چیز لکھی نہیں، لیکن حافظہ ایسا ہے کہ کسی نے کوئی حدیث بیان کی تو اس کو بھولا بھی نہیں اور یہ بھی نہیں ہوا کہ کبھی میں نے (استاذ سے) دوبارہ بیان کرنے کی خواہش کی ہو۔[3] یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے اشعار ہر چیز سے کم یاد ہیں، تاہم اگر میں تم کو اشعار سنانا شروع کروں، تو ایک مہینہ تک کوئی شعر مکرر نہ سناؤں گا۔[4]

④ ابو صالح سمان کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اعمش نے ان سے ایک ہزار حدیثیں سنی تھیں جیسا کہ خود اعمش کا بیان ہے۔[5]

⑤ مکحول خود اپنی نسبت فرماتے تھے کہ میں نے جو چیز اپنے سینے میں رکھ لی پھر جس وقت چاہا اس کو اپنے سینے میں موجود پایا۔[6]

⑥ زہری کا بیان ہے کہ میں نے جو علم اپنے سینے میں رکھ لیا اس کو کبھی نہیں بھولا۔[7]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۱۶ [2] تذکرہ: ص ۷۷ [3] تذکرہ: ۱/۷۹

[4] تذکرہ: ۱/۷۹ [5] تذکرہ: ۱/۸۲ [6] تذکرہ ۲/۱۰۲ [7] تذکرہ: ۱/۱۰۳

سعید کا بیان ہے کہ زہری سے ایک شخص نے حدیثیں لکھوانے کی درخواست کی انہوں نے اس کو چار سو حدیثیں لکھوا دیں، ایک مہینہ کے بعد اس شخص سے پھر ملاقات ہوئی تو اس نے کہا وہ نوشتہ (جس میں چار سو حدیثیں لکھیں تھیں، کھو گیا، زہری نے دوبارہ وہ حدیثیں اس کو لکھوا دیں، جب اس نے دونوں نوشتوں کا مقابلہ کیا تو ایک حرف کا بھی فرق نہ تھا۔[1]

زہری کے بھتیجے کا بیان ہے کہ زہری نے صرف اسی راتوں میں قرآن یاد کرلیا تھا۔ خود زہری کا بیان ہے کہ میں نے کسی حدیث کے متعلق کبھی دوبارہ بیان کرنے کے لئے استاذ سے نہیں کہا نہ کسی حدیث میں کبھی شک پیدا ہوا، صرف ایک دفعہ ایک حدیث میں شک ہوا تھا مگر میں نے اس کی نسبت بھی اپنے ہم سبق سے پوچھا تو وہ اسی طرح تھی جس طرح میں نے اس کو یاد کیا تھا۔[2]

تابعین کے بعد کے طبقے

صحابہ وتابعین کے بعد کے طبقوں میں بھی قوت یادداشت کی یہی فراوانی تھی بلکہ ان طبقوں میں حافظہ کی بعض مثالیں پہلے سے بھی زیادہ حیرت انگیز ملتی ہیں۔

❶ مغیرہ ضبی (تبع تابعی) کے حافظہ کا حال خود ان کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ جو بات ان کے کان میں پڑ گئی، اس کو پھر کبھی نہیں بھولے۔[3]

❷ عمرو بن الحارث مصری (تبع تابعی) کی نسبت ابوحاتم رازی کا قول ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں سب سے بڑے حافظ تھے، حافظہ میں ان کا ہمسر کوئی نہ تھا، اور ابن وہب کا بیان ہے کہ میں نے ان سے زیادہ قوی حافظہ کا انسان نہیں دیکھا۔[4]

❸ معمر (تبع تابعی) کا بیان ہے کہ میں نے چودہ برس کی عمر میں قتادہ سے حدیثیں سنی تھیں جو کچھ اس وقت سنا تھا، وہ آج تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے سینہ میں لکھا

---

[1] تذکرہ: ۱/۱۰۴

[2] تذکرہ: ص ۱۰۴

[3] تذکرہ: ۱/۱۳۵

[4] تذکرہ: ۱/۱۷۳

ہوا ہے۔[1]

④ شعبہ (تابعی) کو اتنی کثرت سے حدیثیں یاد تھیں، کہ ابوداؤد طیالسی نے ان سے سات ہزار حدیثیں سنی تھیں اور غندر نے بھی اتنی ہی حدیثیں ان سے سنی تھیں۔

شعبہ کا خود اپنا بیان ہے کہ صرف ایک ابوالزبیر سے سنی ہوئی مجھ کو سو حدیثیں ازبر ہیں۔[2]

⑤ حماد بن سلمہ (تبع تابعی) کے پاس قیس بن سعد کی مرویات کے سوا کوئی حدیث لکھی ہوئی نہ تھی، بایں ہمہ یحییٰ بن الفریس کے پاس حماد سے سنی ہوئی دس ہزار حدیثیں تھیں اور عمرو بن عاصم کا بیان ہے کہ میں نے حماد سے دس ہزار سے بھی زیادہ حدیثیں سن کر لکھی ہیں۔[3]

⑥ سفیان ثوری کا بیان ہے میں نے اپنے سینہ کو (احادیث کی) جو امانت بھی سپرد کردی، اس نے کبھی خیانت نہیں کی یحییٰ قطان کا بیان ہے کہ میں نے سفیان سے زیادہ حدیث کا حافظ نہیں دیکھا۔[4]

⑦ اسرائیل کا بیان ہے کہ میں ابواسحاق کی مرویت کو اس طرح یاد رکھتا تھا جیسے قرآن کی سورتوں کو۔[5]

⑧ ابن سعد کا بیان ہے کہ وہیب اپنی یاد سے حدیثیں لکھواتے تھے۔[6] باوجودیکہ ان کی روایات بہت زیادہ ہیں۔

⑨ ہشیم کے پاس بیس ہزار حدیثیں تھیں، ابن مہدی کا بیان ہے کہ وہ سفیان ثوری سے بھی بڑھ کر حافظ حدیث تھے۔[7]

ثوری کا حال اوپر پڑھ چکے ہو۔

⑩ داؤد ضبی کا بیان ہے کہ اسماعیل بن عیاش کے ہاتھ میں اس نے کتاب کبھی

---

[1] تذکرہ: ۱/۱۷۹ [2] تذکرہ: ۱/۱۸۳، ۱/۱۸۴ [3] تذکرہ: ۱/۱۹۰

[4] تذکرہ: ۱/۱۹۱ [5] تذکرہ: ۱/۱۹۹ [6] تذکرہ: ۱/۲۱۷ [7] تذکرہ: ۱/۲۲۹

نہیں دیکھی وہ اپنی یاد سے حدیثیں سناتے تھے اور ان کو تیس ہزار حدیثیں یاد تھیں۔[1]

⑪ ابن عیینہ کے پاس سات ہزار کے قریب حدیثیں تھیں اور ان سب کو وہ اپنی یاد سے بیان کرتے تھے۔[2]

⑫ ابن المبارک کے والد ایک دفعہ ان پر خفا ہوئے تو کہا کہ تیری کتابیں میں پا گیا تو جلا دوں گا، ابن المبارک نے کہا کہ اس سے کیا ہو جائے گا وہ سب میرے سینہ میں ہیں، علی بن الحسن بن شقیق کا بیان ہے کہ ایک رات ابن المبارک مسجد سے نکلے میں بھی ساتھ ہو لیا، دروازہ پر انہوں نے حدیث کا ذکر چھیڑ دیا، مذاکرہ کا سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ جب فجر کی اذان کے لئے موذن آیا تو ہم ابھی مذاکرہ ہی کر رہے تھے۔[3]

⑬ عیسیٰ بن یونس کو اپنی حدیثیں اس قدر یاد تھیں کہ فرماتے تھے، اگر میری کتاب میں کہیں ایک واو بھی کوئی بڑھا دے تو وہ مجھ سے چھپ نہیں سکتا۔[4]

⑭ یحییٰ ابن الیمان کو ایک مجلس میں پانچ سو حدیثیں یاد ہو جاتی تھیں۔[5]

⑮ ابو معاویہ نابینا تھے، اس کے باوجود علی بن المدینی کا بیان ہے کہ میں نے ان سے ڈیڑھ ہزار حدیثیں سن کر لکھی ہیں جریر کا بیان ہے کہ ہم اعمش کے پاس سے حدیثیں سن کر اٹھتے تھے تو باہم مذاکرہ کرتے تھے، ہم سب میں ابو معاویہ (نابینا) سے زیادہ کسی کو یاد نہ ہوتا تھا، خود ابو معاویہ کا بیان ہے کہ آنکھ والے لوگ اعمش کی مجلس میں میرے محتاج تھے، اعمش کے کل شاگرد میرے دروازہ پر آتے تھے اور میں ان کی ساری سنی ہوئی حدیثیں بول دیتا تھا وہ لکھ لیتے تھے۔[6]

⑯ مروان بن معاویہ کو اپنی کل حدیثیں یاد تھیں۔[7]

⑰ ابن معین کا بیان ہے کہ حفص بن غیاث نے بغداد اور کوفہ میں جتنی حدیثیں بیان کی ہیں سب اپنی یادداشت سے بیان کی ہیں، کتاب کبھی نہیں نکالی، اور تین چار

---

[1] تذکرہ: ۱/۲۲۴ [2] تذکرہ: ۱/۲۴۲ [3] تذکرہ: ۱/۲۵۵

[4] تذکرہ: ۱/۲۵۹ [5] تذکرہ: ۱/۱۶۳ [6] تذکرہ: ۱/۲۷۱ [7] تذکرہ: ۱/۲۷۲

ہزار حدیثیں ان کی یاد سے لوگوں نے لکھی ہیں۔[1]

⑱ ابن مہدی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ سفیان نے مجھ سے کہا کہ کسی محدث کو مذاکرہ کرنے کے لئے میرے پاس لاؤ، میں یحیٰی قطان کو ساتھ لے گیا سفیان نے ان سے مذاکرہ کیا تو ہکا بکا رہ گئے۔[2]

⑲ ولید بن مسلم کو بڑی بڑی لمبی حدیثیں اور ملاحم کی پیشن گوئیوں والی روایتیں خوب یاد تھیں، ابواب بھی ان کو ازبر تھے۔[3]

⑳ احمد بن صالح کا بیان ہے کہ ابن وہب نے ایک لاکھ حدیثیں بیان کی ہیں۔[4]

㉑ امام احمد کا قول ہے کہ میں نے وکیع سے بڑھ کر کسی کو حافظ نہیں پایا ابو حاتم کا قول ہے کہ وکیع ابن المبارک سے بھی بڑھ کر حافظ تھے، ابوداؤد کا بیان ہے کہ وکیع کے ہاتھ میں حدیث بیان کرنے کے وقت بھی کتاب نہیں دیکھی گئی۔[5]

㉒ وکیع کا بیان ہے کہ محاربی لمبی حدیثوں کے بڑے حافظ تھے۔[6]

㉓ یزید بن ہارون کا خود اپنی نسبت یہ بیان ہے کہ مجھ کو بیس ہزار حدیثیں سند کے ساتھ یاد ہیں اور وہ بھی اتنی پکی کہ ان میں کوئی ایک حرف بھی ملا دے تو جانوں۔

زیاد بن ایوب کا بیان ہے کہ میں نے یزید کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی۔[7]

㉔ زیاد بن ایوب کا بیان ہے کہ ابن علیہ کے ہاتھ میں میں نے کبھی کتاب نہیں دیکھی، ابوداؤد کا بیان ہے کہ ابن علیہ سے حدیث میں کہیں بھول چوک نہیں ہوئی۔[8]

㉕ قواریری کا بیان ہے کہ ابن مہدی نے بیس ہزار حدیثیں اپنی یاد سے مجھ کو لکھوائیں، ذہلی کا بیان ہے کہ ابن مہدی کے ہاتھ میں میں نے کبھی کتاب نہیں

---

[1] تذکرہ: ۱/۲۷٤ [2] تذکرہ: ۱/۲۷٦ [3] تذکرہ: ۱/۲۷۹

[4] تذکرہ: ۱/۲۸۰ [5] تذکرہ: ۱/۲۷۳ [6] تذکرہ: ۱/۲۸۷

[7] تذکرہ: ۱/۲۹۲ [8] تذکرہ: ۱/۲۹٦

دیکھی۔ [1]

㉖ محمد بن عبید طنافسی کی حدیثیں چار ہزار تھیں اور سب از بر تھیں۔ [2]

㉗ ابوداؤد طیالسی کی یاد سے لوگوں نے چالیس ہزار حدیثیں لکھیں۔ [3]

㉘ ابواحمد زبیری کے پاس سفیان ثوری کی احادیث کا بہت بڑا مجموعہ تھا، فرماتے تھے کہ وہ مجموعہ چوری ہو جائے تو مجھ کو اس کی کچھ پرواہ نہیں، وہ سارے کا سارا مجھ کو یاد ہے۔ [4]

㉙ ابوعاصم کو ایک ہزار کھری حدیثیں یاد تھیں اور ہمیشہ اپنی یاد سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ [5]

㉚ علی بن الحسن بن شقیق ابن المبارک کی کتابوں کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ [6]

㉛ سلیمان بن حرب کی نسبت ابوحاتم کا بیان ہے کہ ان کی حدیثوں میں سے دس ہزار حدیثیں ظاہر ہوئی ہیں، اور میں نے ان کے ہاتھ میں کتاب کبھی نہیں دیکھی۔ [7]

㉜ سعید بن منصور المتوفی ۲۲۷ھ نے دس ہزار حدیثیں اپنی یاد سے لکھوائیں، جیسا کہ حرب کرمانی کا بیان ہے۔ [8]

㉝ ابوزرعہ کا بیان ہے کہ امام احمد کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔

㉞ ابوداؤد خفاف کا بیان ہے کہ اسحاق بن راہویہ نے گیارہ ہزار حدیثیں اپنی یاد سے لکھوائیں، پھر ان کو اپنی کتاب سے پڑھ کر سنایا تو کہیں ایک حرف گھٹا نہ بڑھا۔

㉟ امام بخاری کے حافظہ کا حال حاشد بن اسماعیل نے یوں بیان کیا ہے کہ بخاری ہمارے ساتھ حدیث سننے کے لئے محدثین کی مجلسوں میں جایا کرتے تھے، تو لکھتے نہ

---

[1] تذکرہ ۱/۳۰۲، ۳۰۳

[2] تذکرہ: ص ۳۰۵

[3] تذکرہ: ص ۳۲۱

[4] تذکرہ ۱/۳۲۵

[5] تذکرہ: ۱/۳۳۴

[6] تذکرہ ۱/۳۳۷

[7] تذکرہ ۱/۳۳۵

[8] تذکرہ ۲/۵

تھے، بہت دنوں تک ہم یہی دیکھتے رہے ان سے اس باب میں ہم کچھ کہتے تو وہ کچھ نہ بولتے ایک دن انہوں نے کہا کہ تم لوگ مجھ کو بہت کہتے رہے، لاؤ مجھ کو دکھاؤ تم نے اب تک کتنی حدیثیں لکھی ہیں، ہم نے دکھایا تو پندرہ ہزار سے زیادہ حدیثیں تھیں، اس کے بعد انہوں نے ہماری بیاضیں ہم کو دے دیں اور ان حدیثوں کو اپنی یاد سے زبانی سنانا شروع کیا، تو کل کی کل سنا دیں، ان کی یادداشت اتنی درست تھی کہ ہم نے ان کی یاد سے اپنی بیاضوں کی غلطیاں ٹھیک کیں، اس کے بعد بخاری نے کہا کہ تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں اپنا وقت برباد کرنے کے لئے روزانہ آتا ہوں۔[1]

خود بخاری فرماتے تھے کہ مجھ کو ایک لاکھ صحیح حدیثیں اور دو لاکھ غیر صحیح یاد ہیں۔[2]

بخاری کا یہ واقعہ بھی نہایت مشہور ہے کہ جب وہ بغداد گئے ہیں تو وہاں کے محدثین نے متفق ہو کر ان کے حافظہ کا امتحان کرنا چاہا اور اس کی یہ صورت تجویز ہوئی کہ سو حدیثیں چھانٹ کر ان کی سند و متن کو الٹ پلٹ دیا گیا، اس کی سند اس کے ساتھ اور اس کی اس کے ساتھ جوڑ دی گئی، پھر دس محدث چنے گئے، اور ان میں سے ہر ایک کو دس دس حدیثیں دی گئیں کہ جب مجلس میں سب لوگ باطمینان بیٹھ جائیں تو ایک آدمی آگے بڑھ کر ایک حدیث الٹی وپلٹی سند و متن سے پڑھ کر امام بخاری سے پوچھے کہ آپ کو یہ حدیث معلوم ہے، اسی طرح دسوں حدیثوں کو پڑھ پڑھ کر پوچھتا جائے، جب وہ فارغ ہو جائے تو دوسرا آگے بڑھے، اسی طرح دسوں آدمی پوچھیں، یہ طے کر کے بخاری کو ایک مجلس میں دعوت دے کر بلایا گیا اور بہت بڑا مجمع کیا گیا، اس مجمع میں طے شدہ تجویز کے مطابق جو لوگ مقرر ہوئے تھے، انہوں نے پوچھنا شروع کیا، بخاری نے ہر سوال کے جواب میں کہا کہ میں اس کو نہیں جانتا، جب وہ

---

[1] تذکرہ: ۲/۱۲۳، مقدمہ فتح الباری: ص ۵۶۴

[2] تذکرہ: ۲/۱۲۳، مقدمہ ص ۵۷۵

دسوں آدمی پوچھ چکے، تو بخاری نے سب سے پہلے پوچھنے والے کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آپ نے پہلی حدیث یوں پڑھی ہے، حالانکہ وہ اس طرح ہے اور دوسری حدیث کی سند یہ بیان کی ہے حالانکہ اس کی سند یوں ہے، اسی طرح فرداً فرداً ہر حدیث کی سند و متن کی نسبت بیان کر گئے اس وقت لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور ان کے بے مثال حافظہ کے قائل ہو گئے۔[1]

(۲۱) امام ترمذی کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ مکہ کے راستہ میں ان کو معلوم ہوا کہ فلاں محدث آ رہے ہیں، ترمذی نے اس سفر سے پہلے اس محدث کی روایت کی ہوئی حدیثیں کسی شخص سے لے کر نقل کر لی تھیں، اور ان کا خیال تھا کہ وہ اجزاء ان کے ساتھ موجود ہیں، اس لئے چاہا کہ اس محدث سے وہ اجزاء سن کر باقاعدہ سماع حاصل کریں لیکن تلاش کیا تو وہ اجزاء سفر میں ساتھ نہ تھے دل نے گوارا نہ کیا کہ یہ سنہری موقع ہاتھ سے چلا جائے اس لئے ایک سادی بیاض ہاتھ میں لے کر اس محدث کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ کی کچھ مرویات میں نے ایک شخص سے لے کر نقل کی ہیں آپ اپنی زبان سے ان حدیثوں کو سنا دیجئے انہوں نے قبول کر لیا، ترمذی وہی سادی بیاض ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئے اور محدث نے وہ حدیثیں اپنی یاد سے سنانا شروع کیں، اتفاق سے محدث کی نظر بیاض پر جا پڑی دیکھا تو وہ سادی تھی، محدث نے خفا ہو کر کہا کہ تم کو مجھ سے شرم نہیں آتی، ترمذی نے اس کے بعد قصہ سنایا اور کہا کہ وہ اجزاء اگرچہ ساتھ نہیں ہیں مگر اس میں کی سب حدیثیں مجھ کو زبانی یاد ہیں، محدث نے کہا اچھا سناؤ ترمذی نے مسلسل تمام حدیثیں سنا دیں، محدث نے پوچھا کہ تم نے ان کو رٹ لیا تھا ترمذی نے کہا نہیں، پھر کہا آپ ان کے علاوہ دوسری حدیثیں سنا کر بھی امتحان کر لیجئے، چنانچہ محدث نے اپنی مخصوص چالیس حدیثیں سنا کر ان سے کہا کہ اب یہ حدیثیں تم سناؤ، ترمذی نے اسی وقت اول سے آخر تک سنا

---

[1] مقدمہ: ص ۵۷۳

دیں وہ محدث محو حیرت ہو گئے اور فرمایا کہ میں نے تم سا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔[1]

(۷۷) ایک شخص ابوزرعہ کے پاس آیا، اور کہا کہ میرے منہ سے یہ نکل گیا ہے کہ اگر ابوزرعہ کو ایک لاکھ حدیثیں یاد نہ ہوں تو میری بی بی کو طلاق۔ ابوزرعہ نے کہا تمہاری بی بی مطلقہ نہیں ہوئی (یعنی مجھ کو اتنی حدیثیں یاد ہیں)۔[2]

ابوزرعہ فرماتے تھے کہ ایک لاکھ حدیثیں مجھ کو اس طرح یاد ہیں جس طرح کسی کو قل ہو اللہ یاد ہوتی ہے۔[3]

نیز فرماتے تھے کہ میں نے اپنے ہاتھ سے جو دفتر حدیثوں کے لکھے ہیں، ان میں سے کسی کسی کو لکھے ہوئے پچاس برس ہو چکے ہیں اور اس وقت سے آج تک اس کو پھر دیکھا بھی نہیں ہے باایں ہمہ میں ہر حدیث کی نسبت جانتا ہوں کہ وہ کس کتاب میں کس ورق میں کس صفحہ میں اور کس سطر میں ہے۔[4]

(۷۸) ابو اللیث کا اپنی نسبت بیان ہے کہ مجھ کو دس ہزار غیر مکرر حدیثیں یاد ہیں۔[5]

(۷۹) ابن عاصم کی کتابیں ایک ہنگامہ میں ضائع ہو گئیں، تو انہوں نے اپنی یاد سے پچاس ہزار حدیثیں لکھ لیں۔[6]

(۸۰) خطیب کا بیان ہے کہ جزرہ ایک مدت تک اپنی یاد سے حدیثیں بیان کرتے رہے اس لئے کہ کوئی کتاب ساتھ نہیں لی تھی۔[7]

میں سمجھتا ہوں کہ یہ واقعات پڑھتے پڑھتے اب آپ گھبرا گئے ہوں گے اس لئے اتنی مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ اس موضوع پر تو مستقل ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

روایت میں محدثین کی بے نظیر احتیاط

اس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی بہت زیادہ قابل توجہ ہے، اور وہ یہ کہ آنحضرت

---

[1] تہذیب التہذیب: ۹/۳۸۶؛ تذکرہ، ۲/۱۸۸
[2] تذکرہ، ۲/۷۴
[3] تہذیب، ۷/۳۳
[4] تہذیب، ۷/۳۳
[5] تذکرہ، ۲/۱۴۹
[6] تذکرہ، ۲/۱۹۴
[7] تذکرہ، ۲/۱۹۵

ﷺ نے جہاں اپنی حدیثوں کی اشاعت و تبلیغ کے لئے [illegible] ری تاکیدیں کی ہیں، وہاں اس بات کی بھی نہایت سخت تاکید کی ہے کہ کوئی [illegible] بات آپ کی طرف منسوب نہ ہونے پائے، اس لئے ابتداء ہی سے محدثین کا گروہ حدیثوں کی روایت کرنے میں بے حد محتاط رہا ہے، چنانچہ بعض صحابہ صرف اس ڈر سے کہ بیان کرنے میں کمی بیشی نہ ہو جائے بہت کم حدیثیں بیان کرتے تھے، جیسا کہ حضرت زبیر ؓ کا واقعہ صحیح بخاری (جلد ۱ صفحہ ۲۱) میں مذکور ہے۔

حضرت انس ؓ کا یہ حال تھا کہ جس حدیث میں ان کو ذرا بھی شبہ ہوجاتا کہ یہ حدیث خوب اچھی طرح یاد نہیں ہے، تو وہ اس کو بیان ہی نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ غلطی کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں بیان کرتا۔[1]

امام ربانی محمد باقر کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمر ؓ کو سب سے زیادہ اس بات کا اہتمام تھا کہ حدیث میں ذرہ برابر بھی کوئی کمی بیشی نہ ہو۔[2]

چنانچہ صحیح مسلم (جلد ۱ صفحہ ۳۲) میں ہے ایک دفعہ حضرت ابن عمر ؓ نے یہ حدیث بیان کی "بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا اللّٰه وان محمدا رسول اللّٰه واقام الصلوة وايتاء الزكوة وصيام رمضان والحج" حضرت ابن عمر ؓ کے بیان کرنے کے بعد مجلس میں کسی شخص نے اس حدیث کو دہرایا، تو یوں کہہ دیا "والحج و صيام رمضان" حضرت ابن عمر ؓ نے اس کو فوراً ٹوکا اور فرمایا، یوں نہیں بلکہ "وصيام رمضان والحج" میں نے آنحضرت ﷺ سے اسی طرح سنا ہے۔

غور فرمایئے کہ باوجودیکہ معنی میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی تھی پھر بھی جس ترتیب سے حدیث کے الفاظ آنحضرت ﷺ سے سنے تھے، اس میں یہ معمولی سا تغیر بھی ان کو گوارا نہ تھا، دارمی (صفحہ ۵۱) میں عبداللہ بن عمر کا ایسا ہی ایک دوسرا واقعہ

---

[1] دارمی: ص ۴۲ [2] تذکرہ: ص ۳۷

ایک دوسری حدیث کے باب میں بھی مذکور ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کی نسبت تذکرۃ الحفاظ میں مذکور ہے:

"کان ممن یتحری فی الاداء ویشدد فی الروایۃ ویزجر تلامذتہ عن التہاون فی ضبط الالفاظ."[1]

ترجمہ: "ان کا شمار ان حضرات میں ہے جن کو ادائے حدیث میں بے حد احتیاط اور روایت کے باب میں بڑا تشدد تھا اور وہ اپنے شاگردوں کو الفاظ[2] حدیث کے ضبط کرنے میں سستی پر بہت ڈانٹتے رہتے تھے۔"

حضرت زید بن ارقم کا جب بڑھاپا آیا، اس وقت کوئی شخص حدیث بیان کرنے کو کہتا تو فرماتے کہ اب ہم بوڑھے ہوگئے اور آنحضرت ﷺ کی حدیث بیان کرنا بڑا مشکل کام ہے۔[3]

اسی احتیاط کا تقاضا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنے شاگردوں کو ہدایت کیا کرتے تھے کہ جب تم حدیث کی روایت کرنے کا ارادہ کرو تو پہلے اس کو تین دفعہ دہرالیا کرو۔[4]

نیز اسی شدت احتیاط ہی کی وجہ سے حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی بڑی تاکید تھی کہ آنحضرت ﷺ سے حدیثوں کی روایت کم کی جائے۔

صحابہ کرام کے یہ واقعات پڑھنے کے بعد آپ ہی انصاف سے کہئے کہ جس جماعت کو اس قدر احتیاط کا پاس ولحاظ ہو اس کی نسبت یہ خیال قائم کرنے کا تو کسی درجہ میں کوئی امکان ہی نہیں کہ اس نے جان بوجھ کر غلط تو درکنار کوئی مشکوک ہی بات آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کی ہوگی۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۱۳

[2] امام مالک کا یہ حال تھا کہ وہ بے اور تے کا بھی خیال رکھتے تھے۔ (تذکرہ: ۱/ ۱۹۸)

[3] ابن ماجہ: ص ۴ [4] دارمی: ص ۷۸

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ جب احتیاط کا یہ عالم تھا اور حدیثوں کی روایت سے بھی چارہ کار نہ تھا تو لازمی طور پر حدیثوں کو یاد رکھنے اور ان کو بعینہٖ حافظہ میں محفوظ رکھنے کا بھی انتہائی اہتمام ہوگا اس حالت میں بھول چوک سے بھی حدیثوں کا کچھ سے کچھ ہونا بعید از قیاس ہے۔

خصوصاً جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ شروع ہی سے اس کا بھی اہتمام تھا کہ ایک شخص کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو مزید اطمینان کے لئے کوئی دوسرا اس کا موید تلاش کیا جاتا تھا جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ (جلد۱ صفحہ۳) میں مذکور ہے کہ جب حضرت مغیرہ ؓ نے یہ بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے دادی کو پوتے کی میراث سے چھٹا حصہ دلوایا ہے تو حضرت ابوبکر ؓ نے ان سے دریافت کیا کہ کوئی اور بھی آنحضرت ﷺ سے اس بات کو نقل کرنے میں تمہارا شریک ہے؟ معلوم ہوا کہ حضرت محمد بن سلمہ ؓ بھی اس کو جانتے ہیں، چنانچہ انہوں نے آکر شہادت دی تو حضرت ابوبکر نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔

اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ نے حضرت عمر ؓ سے ایک حدیث بیان کی تو انہوں نے حکم دیا کہ اس پر کوئی دوسری شہادت پیش کرو، حضرت ابوموسیٰ انصار کے مجمع میں گئے اور ان سے پوچھا کہ آپ لوگوں میں سے کسی نے آنحضرت ﷺ سے فلاں حدیث سنی ہے انہوں نے کہا کہ ہم سب نے یہ حدیث سنی ہے، حضرت ابوموسیٰ ؓ نے ان میں سے ایک انصاری کو ساتھ لیا اور حضرت عمر ؓ کے سامنے ان سے شہادت دلوائی۔[1]

خود حضرت عمر ؓ نے ایک دفعہ ایک حدیث کو بیان کرنا شروع کیا تو فرمایا کہ ڈر تو لگتا ہے کہ کوئی کمی بیشی نہ ہو جائے، لیکن عمار نے بھی میرے ساتھ اس حدیث کو سنا ہے اس لئے میں بیان کرتا ہوں، تم عمار کے پاس آدمی بھیج کر ان سے بھی تصدیق

---

[1] تذکرہ: ۱/۶

کرائو، چنانچہ عمار کو بلا کر پوچھا گیا تو انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیان کی تصدیق و تائید کی۔[1]

ان واقعات کے ذکر کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ جب ایک کے بیان کی دوسرے سے تصدیق کرانے کا بھی دستور تھا تو اس کے باوجود یہ خیال کرنا کہ صرف حافظہ پر مدار ہونے کی وجہ سے حدیثیں بگڑ گئی ہوں گی، نرا وہم ہی وہم ہے، تنہا ایک آدمی کے بیان میں ایسا شک کیا بھی جا سکے تو دو ہو جانے کی صورت میں ایسا شک قطعاً درخور التفات نہیں ہے۔

بلکہ میں تو جرأت کر کے یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ ایسا شکی مزاج انسان قرآنی تعلیمات کی روح سے یقیناً بے بہرہ ہے، قرآن پاک نے جہاں یہ تعلیم دی ہے کہ دو پسندیدہ مرد گواہ بنانے کے لئے نہ ملیں تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں گواہ بنا لی جائیں، وہاں خود ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ دو عورتوں کو گواہ بنانے کے لئے اس لئے کہا کہ اگر ایک عورت بھولے بھٹکے گی تو دوسری عورت یاد دلا دے گی ﴿ان تضل احدٰھما فتذکر احدٰھما الاخری﴾[2]

حدیث کو شک کی نگاہ سے دیکھنے والے آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ قرآن پاک نے دو ہو جانے کے بعد اس احتمال و شک کا کہ ممکن ہے دو بھی بھول جائیں اور دونوں کو سہو و نسیان ہو جائے، قطعاً اعتبار نہیں کیا اور اس پر بھی غور کریں کہ دو عورتوں کے باب میں ایسے شک و وہم کا قرآن نے اعتبار نہیں کیا تو دو مردوں کے باب میں اس کا کب اعتبار ہو سکتا ہے، جب کہ قرآن پاک کے اسی مقام سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مرد اس باب میں دو عورتوں کے برابر ہے۔

محدثین پر سلطنت کی ہوا خواہی کا الزام

حدیث کی بے اعتباری کی ایک وجہ ''حق گو'' صاحب نے یہ بھی تراشی اور گڑھی

---

[1] ابو داؤد مجتبائی: ص ۱۰ [2] بقرہ

ہے کہ محدثین نے حدیثوں میں سلطنت کے جذبات و عواطف کی رعایت کی ہے۔

محدثین کے اعلیٰ کیرکٹر ان کی نہایت بلند اخلاقی جرأت اور ان کی بے مثل صداقت و امانت پر ''حق گو'' صاحب کا یہ نہایت سخت حملہ ہے، ''حق گو'' صاحب کو اس لحاظ سے تو ہم معذور سمجھتے ہیں کہ غلام قوم کا ایک غلام فرد اور وہ بھی حکومت کا تنخواہ دار نوکر اس اخلاقی جرأت کا تصور بھی نہیں کر سکتا جو محدثین کا طرۂ امتیاز تھی۔

لیکن تاریخی حقائق سے چشم پوشی کرنے میں وہ کسی طرح معذور قرار نہیں دیئے جا سکتے، تاریخ دان حضرات جانتے ہیں کہ محدثین میں بہت سے ایسے افراد ہیں جن کو حکومت سے ایسا سخت اختلاف تھا جس کی وجہ سے وہ حکومت کے مورد عتاب تھے، مثلاً۔

❶ سعید بن جبیر کو حجاج کی حکومت سے ایسا اختلاف تھا کہ اسی اختلاف کی بنا پر ان کو حجاج نے نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالا۔[1]

❷ یحییٰ بن ابی کثیر کو حکومت بنی امیہ پر نکتہ چینی کرنے کی وجہ سے بڑے بڑے مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا حتیٰ کہ مار بھی کھانا پڑی۔[2]

محدثین میں بہت سے وہ لوگ تھے جنہوں نے بہت بڑے جابر بادشاہوں کے سامنے ان پر نکتہ چینی کی اور حق بات کہنے میں جان کی پرواہ نہیں کی۔

❸ اس سلسلہ میں امام اوزاعی کا واقعہ سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہے، حافظ ذہبی نے سفیان وغیرہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جب خلیفہ عباسی کا چچا عبداللہ بن علی شام میں داخل ہوا، اور بنو امیہ کو چن چن کے مروا چکا تو ایک دن اس نے اس طرح دربار سجانے کا حکم دیا کہ ایک صف ایسے جوانوں کی آراستہ کی جائے جن کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں ہوں، دوسری صف ان کی ہو جن کے ہاتھ میں بلم ہوں، تیسری صف میں وہ سپاہی ہوں جن کے ساتھ کافر کوب ہوں، اور چوتھی صف

---

[1] تذکرہ: ۷۲/۱

[2] تذکرہ: ۱۲۱/۱

میں وہ کھڑے کئے جائیں جن کے ساتھ گرز ہوں، جب حکم کے مطابق دربار سج چکا تو ایک پیادہ بھیج کر اس نے اوزاعی کو بلوایا، اوزاعی بارگاہ کے دروازہ پر پہنچے تو سواری سے اتارے گئے اور دائیں بائیں سے دو سپاہی ان کے دونوں بازو تھام کر صفوں کے بیچ میں لے چلے جب اتنے قریب پہنچ گئے جہاں سے عبداللہ ان کی بات سن سکے، تو وہاں ان کو کھڑا کر دیا اس کے بعد عبداللہ اور اوزاعی میں حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

عبداللہ۔ تم عبدالرحمن بن اوزاعی ہو۔

اوزاعی۔ ہاں، خدا امیر کی اصلاح فرمائے۔

عبداللہ۔ بنی امیہ کے قتل کے باب میں تمہارا کیا خیال ہے۔

اوزاعی۔ آپ سے اور ان سے کچھ معاہدے تھے جن کی پابندی اور عہد کا ایفاء ان پر لازم تھا۔

عبداللہ۔ اجی صاحب! اس کو چھوڑیے، فرض کیجئے کہ ہمارے ان کے کوئی معاہدہ اور ہم سے ان سے کوئی عہد و پیمان نہ رہا ہو۔

اوزاعی (نے دیکھا کہ اب صاف صاف جواب کے سوا چارہ کار نہیں ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ صاف جواب دینے کے بعد جان بچنا بھی ممکن نہیں۔ مرنے کو کس کا دل چاہتا ہے، مگر میں نے سوچا کہ اللہ کے حضور میں ایک دن کھڑا ہونا ہے، اس لئے میں نے نڈر ہو کر کہا کہ) اس صورت میں ان کا قتل آپ پر حرام تھا، یہ سنتے ہی وہ آگ بگولہ ہو گیا گردن کی رگیں پھول گئیں اور سرخ سرخ آنکھیں نکال کر بولا۔

عبداللہ۔ یہ تم نے کیسے کہا، اور کیوں کہا؟

اوزاعی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسلمان کا خون تین ہی صورتوں میں روا ہو سکتا ہے، شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے، یا کسی کو قتل کر دے۔ یا مرتد ہو جائے اور بنو امیہ جن کو تم نے قتل کرایا ہے، ان میں سے کسی جرم کے مرتکب نہ تھے۔

عبداللہ۔ اجی کیا دیانۃً حکومت وخلافت ہمارا (ہاشمیوں کا) ہی حق نہیں ہے۔

اوزاعی۔ وہ کیسے؟

عبداللہ۔ کیا آنحضرت ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ (ہاشمی) کو اپنا وصی نہیں بنا گئے تھے۔

اوزاعی۔ اگر وصی بنا گئے ہوتے تو حضرت علی صفین کے موقع پر دو شخصوں کو حکم مان کر یہ نہ کہتے کہ تم جس کو حاکم وخلیفہ مقرر کر دو مجھے قبول ومنظور ہے۔

یہ سن کر عبداللہ بالکل خاموش ہو گیا، اس کے غصہ کا پارہ آخری ڈگری پر پہنچ چکا تھا، اور امام اوزاعی خیال کر رہے تھے کہ اب میرا سر میرے سامنے گرا چاہتا ہے کہ اتنے میں عبداللہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اس کو دربار سے نکالو، اوزاعی دربار سے نکل آئے لیکن ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے، کہ دیکھا کہ ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کے پاس چلا آ رہا ہے، یہ سمجھے کہ میرا سر قلم کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے، اس لئے جلدی سے اپنی سواری سے اترے کہ دو رکعت نماز پڑھوں، اور اللہ اکبر کہہ کے نیت باندھ لی، ابھی نماز ہی میں تھے کہ سوار آ پہنچا، جب فارغ ہوئے تو اس نے سلام کیا اور کہا کہ امیر نے یہ اشرفیاں آپ کے پاس بھجوائی ہیں، اوزاعی فرماتے ہیں کہ میں نے ان اشرفیوں کو گھر پہنچنے سے پیشتر ہی تقسیم کر کے ختم کر دیا۔[1]

③ ابن ابی ذئب کی جرات کا یہ عالم تھا کہ ابوجعفر منصور جیسے ہیبت و رعب بادشاہ کے سامنے بھی وہ حق بات کہنے میں ذرا نہ دبے اور صاف کہہ دیا کہ تیرے دروازہ پر کھلم کھلا ظلم کی گرم بازاری ہے۔[2]

ابونعیم کا بیان ہے کہ جس سال خلیفہ منصور نے حج کیا ہے، اسی سال مجھ کو بھی یہ سعادت نصیب ہوئی تھی یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ منصور جب مکہ معظمہ پہنچا تو اس نے ابن ابی ذئب کو بلا بھیجا جب وہ آئے تو دار الندوہ میں ان کو اپنے ساتھ بٹھا

---

[1] تذکرہ: ۱/۱۷۰

[2] تذکرہ: ۱/۱۸۰

کر پوچھا کہ حسن بن زید (علوی جو منصور کی طرف سے مدینہ کے قاضی تھے، مگر منصور کسی بات پر ان سے برہم ہو گیا تھا اور قضاء سے برطرف کر کے ان کو جیل خانہ بھجوا دیا تھا) کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟ ابن ابی ذئب نے کہا وہ انصاف شعار و عدل گستر تھے، منصور نے کہا کہ اور میری نسبت کیا رائے ہے؟ ابن ابی ذئب نے پہلے سکوت کیا لیکن منصور نے بار بار پوچھا تو ابن ابی ذئب نے خانہ کعبہ کی طرف اشارہ کر کے صاف فرمایا کہ اس گھر کے مالک کی قسم کہ تو بے انصاف و ناحق پرست ہے۔

منصور کے دربان ربیع نے یہ تلخ اور بے باکانہ جواب سن کر ابن ابی ذئب کی داڑھی پکڑ لی، مگر منصور نے اس کو ڈانٹا کہ حرام زادے چھوڑ دے۔

ابن ابی ذئب منصور کے بیٹے مہدی کے عہد حکومت میں بھی زندہ تھے، چنانچہ جس وقت مہدی نے حج کیا ہے اور حج سے فارغ ہو کر روضہ اطہر کی زیارت کے لئے مسجد نبوی میں حاضری دی تو مسجد میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جو اس کو دیکھ کر تعظیماً کھڑا نہ ہو گیا ہو صرف ایک ابن ابی ذئب تھے جنہوں نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کی، کسی نے کہا کہ حضرت کھڑے ہو جائیے، یہ امیر المؤمنین ہیں، تو برجستہ فرمایا "انما یقوم الناس لرب العالمین" کہ میاں رب العالمین کے لئے لوگ کھڑے ہوا کرتے ہیں۔

مہدی یہ جواب سن کر کانپ گیا اور اس نے ڈانٹا کہ ان کو نہ چھیڑو میرے بدن کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہو گیا۔[1]

⑤ یزید بن ابی حبیب مصری ایک دفعہ بیمار ہوئے تو مصر کا حاکم حوثرہ ان کی عیادت کو آیا، باتوں باتوں میں اس نے یہ مسئلہ پوچھ لیا کہ کپڑے میں مچھر یا کھٹمل کا خون لگا ہو تو اس سے نماز ہو گی یا نہیں، یزید نے یہ سن کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کچھ جواب نہ دیا، جب وہ اٹھ کر جانے لگا تو یزید نے اس کی طرف دیکھ کر کہا کہ

---

[1] تذکرہ: ۱/۱۸۱

روزانہ کتنی مخلوق خدا کا خون بہاتے ہو تو کچھ نہیں اور کھٹمل یا مچھر کے خون کا مسئلہ دریافت کرنے آئے ہو۔[1]

⑥ امام سفیان ثوری مہدی کے دربار میں گئے تو اس سے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے سفر حج میں صرف بارہ اشرفیاں خرچ کی تھیں، مہدی نے سنا تو اس کو غصہ آگیا اور گرم ہو کر بولا تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمہاری سی حالت میں ہو جاؤں، سفیان نے نہایت بے باکی سے کہا کہ اگر میری سی حالت میں ہونا گوارا نہ ہو تو جس حالت میں تم ہو اس میں بھی نہ ہونا چاہئے۔[2]

⑦ خلیفہ منصور حج کو چلا تو سولی دینے والوں کو حکم دے دیا کہ سفیان جہاں مل جائیں ان کو دار پر چڑھا دو، لیکن خدا کی شان کہ مکہ پہنچنے سے پہلے ہی منصور کا انتقال ہو گیا، اور سفیان کو سولی دینے کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔[3]

⑧ مہدی اور سفیان کی تیز تیز گفتگو اوپر آپ پڑھ چکے ہیں، آخر آخر میں سفیان اور مہدی کی آپس میں کشیدگی اتنی بڑھ گئی تھی کہ سفیان کو بصرہ میں روپوش ہونا پڑا، اور اسی حالت میں ان کی وفات بھی ہو گئی۔

⑨ محدثین میں کتنے حضرات ایسے ہیں جن سے بادشاہوں نے یہ خواہش کی کہ دولت کدہ شاہی پر حاضر ہو کر شاہزادوں کو حدیثیں سنا جائیں، لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا اور نہایت بے پروائی سے ان کی یہ خواہش ٹھکرا دی، بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی حاکم نے کسی محدث کو مسئلہ پوچھنے کے لئے بارگاہ میں بلایا تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ تم خود آؤ، چنانچہ زبان بن عبدالعزیز (مصر کے گورنر لڑکے) نے یزید بن ابی حبیب مصری کے پاس پیادہ بھیج کر کہلایا کہ مجھ کو ایک مسئلہ پوچھنا ہے ذرا دیر کے لئے تشریف لائیے تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ تم خود آکر پوچھ جاؤ تمہارا میرے پاس آنا تمہارے حق میں خوبی و زیبائش ہے، اور میرا آنا تمہارے لئے عیب و بدنمائی

---

[1] تذکرہ: ۱/۱۲۲

[2] تذکرہ: ۱/۱۶۲

[3] تہذیب: ص ۱۱۴

ہے۔[1]

⑩ مہدی جس وقت مدینہ منورہ میں حاضر ہوا تو اس نے امام مالک کے پاس دو یا تین ہزار اشرفیاں بھجوائیں، جب مہدی مدینہ سے رخصت ہونے لگا تو ربیع امام مالک کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المؤمنین چاہتے ہیں کہ آپ بغداد تک ان کے ہمرکاب تشریف لے چلیں امام نے جواب دیا کہ سرکار رسالت ﷺ کا ارشاد ہے کہ مدینہ کے باشندوں کے لئے مدینہ ہی بہتر ہے، اگر وہ سمجھیں اور اگر اشرفیوں کا خیال ہو تو وہ اب تک جیسی کی تیسی رکھی ہوئی ہیں۔[2]

⑪ مہدی کا بیٹا خلیفہ ہارون رشید خود امام مالک کے گھر پر حاضر ہوا شاہزادے بھی ساتھ تھے، امام سے درخواست کی کہ میرے لڑکوں کو اپنی کتاب موطا اپنی زبان سے سنا دیجئے، امام نے صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں نے ایک مدت سے کسی کو پڑھ کر نہیں سنایا ہے، لوگ خود پڑھ کر مجھے سناتے ہیں، ہارون نے کہا اچھا اور لوگوں کو ہٹا کر تخلیہ کرا دیجئے تو میں خود پڑھ کر آپ کو سناؤں، امام نے فرمایا کہ جب کسی خاص شخص کی وجہ سے عام لوگوں کو علم سے محروم رکھا جاتا ہے تو خاص کو بھی کوئی نفع نہیں پہنچتا، اس کے بعد امام نے معن بن عیسیٰ کو حکم دیا کہ تم پڑھو اور بادشاہ مع شاہزادوں کے سنے۔[3]

⑫ ہارون الرشید بغداد سے حج کے لئے روانہ ہوا تو کوفہ میں پہنچ کر عبداللہ ابن ادریس اور عیسیٰ بن یونس کے پاس آدمی بھیجے کہ ہمارے پاس آکر حدیثیں بیان کر جائیے دونوں نے آنے سے انکار کر دیا، مجبوراً امین و مامون دونوں شہزادے ابن ادریس کے پاس خود گئے اور ان سے حدیث بیان کرنے کی درخواست کی، ابن ادریس نے قبول فرما لیا، اور سو حدیثیں ان کو سنائیں، جب بیان کر چکے تو مامون نے عرض کیا کہ چچا! اجازت ہو تو میں اپنی یاد سے آپ کے سامنے ابھی ان حدیثوں کو

---

[1] تذکرہ: ۱۲۲/۱ [2] تذکرہ: ۱۹۶/۱ [3] تذکرہ: ۱۹۷/۱

دہرا دوں، ابن ادریس نے اجازت دی اور مامون نے سب حدیثیں سنا دیں، ابن ادریس کو مامون کے حافظہ پر بڑا تعجب ہوا، یہاں سے اٹھ کر دونوں شاہزادے عیسیٰ بن یونس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حدیث سنانے کی درخواست کی، انہوں نے بھی منظور کر لیا، اور حدیثیں سنائیں اس کے بعد مامون نے دس ہزار اشرفیاں (یا درم) نذرانہ کے طور پر پیش کئے مگر ابن یونس نے قبول نہ کیا، اور فرمایا کہ ایک چلو پانی تک تو تمہارا پی ہی نہیں سکتا۔[1]

⑬ محدثین کو بادشاہوں کے تقرب سے اتنی نفرت تھی کہ ابن ادریس کے نام ہارون الرشید کا ایک فرمان آیا، ابھی اتنا ہی پڑھایا گیا تھا کہ خدا کے بندہ ہارون کی طرف سے عبداللہ بن ادریس کے نام کہ ابن ادریس نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئے اور ظہر کے بعد سے مغرب تک بے ہوش رہے، مغرب سے ذرا پہلے پانی کا چھینٹا دیا گیا تو ہوش آیا، ہوش میں آنے کے بعد فرمایا کہ "اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" ہارون بھی مجھے جاننے لگا، خدا جانے مجھ سے کون سا گناہ صادر ہوا کہ اس نے میرے پاس خط لکھا۔[2]

⑭ وکیع کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ہارون کا ارادہ ہوا کہ ابن ادریس کو قاضی مقرر کرے مگر انہوں نے سختی سے انکار کر دیا، ہارون نے ان کو بلا کر اس کے لئے ان سے گفتگو کی تو انہوں نے کہہ دیا کہ میں اس کام کے لائق نہیں ہوں، ہارون نے خفا ہو کر کہا کہ میں تمہاری صورت نہ دیکھے ہوتا تو اچھا تھا، ابن ادریس نے کہا کہ میری بھی یہی تمنا تھی کہ تمہاری صورت نہ دیکھتا یہ کہہ کر چلے آئے۔[3]

ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی

مئو ۱۳۶۰ھ

* * *

---

[1] تذکرہ: ۱/۲۵۹ [2] تذکرہ: ۱/۲۶۱ [3] تذکرہ: ۱/۲۶۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

تمہید

مجھے اپنے ایک فاضل دوست کے توسط سے منکرین حدیث کے ایک رسالہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا عنوان ہے، ”میں منکر حدیث کیوں ہوا“ اس رسالہ میں کسی ”حق گو“ صاحب نے انکار حدیث کے وجوہ بیان فرمائے ہیں، اور رواۃ حدیث و مصنفین کتب حدیث پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بہت زیادہ غلط بیانی سے کام لیا ہے، اور نہایت نامعقول اور گمراہ کن طریقہ سے عوام کو حدیثوں سے بدظن کرنے کی کوشش کی ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ رسالۂ مذکورہ پر ایک تبصرہ لکھ کر ”حق گو“ صاحب کی غلط بیانیوں اور فریب کاریوں کا پردہ چاک کر دیا جاتا، میں خدائے علیم وقدیر کا شکر گزار ہوں کہ اس نے اپنے اس ناتواں بندہ کو اس خدمت کی توفیق بخشی ”فتقبلها الله منى كما وفقنى لها.“

”حق گو“ کے رسالہ پر اجمالی تبصرہ

میں سمجھتا ہوں کہ رسالہ مذکورہ پر تفصیلی تبصرہ کرنے سے پہلے حدیث کی حیثیت اور اس کی حجیت پر قرآن کریم سے روشنی ڈال دی جائے، تو رسالہ مذکورہ اور منکرین حدیث کے دوسرے تمام رسائل پر ایک اجمالی تبصرہ اور ان کا اصولی رد ہو جائے گا، اس لئے پہلے اسی چیز کو پیش کرتا ہوں۔

قرآن کریم اور حدیث

قرآن کریم دنیا میں خدا کی آخری کتاب ہے اور تمام مسلمانوں کا ایمان ہے

کہ یہ کتاب آسمانی دوسری تمام الہامی کتابوں سے بہت زیادہ جامع مکمل اور مفصل ہے اس میں عبادات واخلاق، معاشرت ومعاملات، سیاست واقتصاد ومعاش ومعاد ہر چیز کا بیان ہے لیکن یہ بھی بالکل بدیہی ہے، کہ امور متذکرہ بالا کا بیان قرآن کریم میں کلی اور اصولی طور پر ہے اور یہی ہونا بھی چاہئے اس لئے کہ اولاً تو امور مذکورہ کی جملہ جزئیات کا فرداً فرداً تفصیلی بیان قرآن کریم کے برابر محدود ومتناہی کتاب میں ممکن ہی نہیں، ثانیاً ایسے تفصیلی بیان کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے، ہر آدمی جس کو علم سے کچھ تعلق ہے یہ جانتا ہے کہ دنیا کے جملہ علوم وفنون کی کتابوں میں صرف اصولی مسائل اور قوانین کلیہ اور قواعد وضوابط کے بیان پر اکتفاء کیا جاتا ہے، اور مصنفین کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ طالب علم استاد کی مدد سے ان کلیات کا علم اس طرح حاصل کرے کہ جزئیات کے احکام وحالات انہی کلیات سے معلوم کر سکے۔

رسول اللہ ﷺ معلم قرآن تھے

ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ اللہ رب العزت نے دنیا کی ہدایت کے لئے قرآن کریم کو اکیلا نہیں بھیجا تھا اور قرآن کے ذریعہ سے اصلاح وہدایت کی یہ شکل اختیار نہیں کی تھی کہ اس کو کتابی شکل میں بھیج کر لوگوں سے کہہ دیا ہو کہ اس کتاب کو ہر شخص بطور خود پڑھ پڑھ کر اس پر عمل پیرا ہو جائے، بلکہ قرآن سے پہلے اپنے ایک برگزیدہ رسول (ﷺ) کو بھیج کر انہی کے سینہ معارف گنجینہ میں قرآن نازل کیا اور آپ کو مکلف فرمایا کہ ① آپ لوگوں کو قرآن کی آیتیں پڑھ کر سنائیں ② اور اس کتاب کا درس وتعلیم بھی دیں، اور اس کے رموز واسرار لوگوں پر کھول دیں، قرآن کریم نے کئی مقامات میں اس کی تصریح کی ہے۔

❶ ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ

تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾[1]

ترجمہ: ”جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے کہ پڑھتا ہے تم پر ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تم کو اور سکھاتا ہے تم کو کتاب و حکمت اور سکھاتا ہے تم کو وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے۔“

② ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾[2]

ترجمہ: ”بہ تحقیق احسان کیا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جب کہ بھیجا ان میں ایک رسول انہی میں سے کہ تلاوت کرتا ہے ان پر ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے ان کو اور تعلیم کرتا ہے ان کو کتاب و حکمت کی بالیقین تھے وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں۔“

③ ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾[3]

ترجمہ: ”(وہی) وہ ذات ہے جس نے بھیجا ان پڑھوں میں ایک رسول انہی میں سے کہ تلاوت کرتا ہے ان پر ہماری آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی ان کو تعلیم دیتا ہے بالیقین وہ تھے اس سے پہلے کھلی گمراہی میں۔“

ان آیات میں بکرات و مرات تصریح کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ وہ قرآن کی آیتیں لوگوں کو سنا دیتے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ کتاب و حکمت کی تعلیم اور درس قرآن بھی ان کے فرائض رسالت میں سے

---

[1] بقرہ پارہ ۲ [2] آل عمران پارہ ۴ [3] جمعہ پارہ ۲۸

ایک اہم فریضہ ہے، درحقیقت ان آیات میں خدائے تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے کہ ہم نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور انہوں نے عرب میں جیسا رسول بھیجنے کی درخواست کی تھی بعینہٖ انہی اوصاف کا جامع اور انہی خصوصیات کا حامل رسول ہم نے ان میں مبعوث کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا خود قرآن مجید میں بایں الفاظ منقول ہے۔

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾[1]

تَرجَمَہ: ''اے ہمارے مالک! اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں سے کہ تلاوت کرے ان پر تیری آیتیں اور سکھائے ان کو کتاب و حکمت اور پاک کرے ان کو بے شک تو ہی غالب (اور) حکمت والا ہے۔''

تعلیم کتاب کا مطلب

اب غور طلب امر یہ ہے کہ تلاوت آیات کے بعد تعلیم کتاب و حکمت سے کیا مراد ہے؟ آیا کتاب اللہ کا لفظی ترجمہ اور لغوی مفہوم بتانا یا اس کے معانی و مطالب اسرار و حکم اور وہ فروع و جزئیات جو اس سے مستنبط ہوتے ہیں ان سے لوگوں کو آشنا کرنا ظاہر ہے کہ پہلی صورت تو قطعاً مراد نہیں ہے اس لئے کہ عرب جن میں آپ مبعوث ہوئے تھے اور جو عہد نبوی میں قرآن کے مخاطب اول تھے وہ اس تعلیم سے بے نیاز تھے، قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور یہ زبان ان لوگوں کی اپنی مادری زبان تھی، لہٰذا قرآن کا لفظی ترجمہ اور مفہوم لغوی ان کو معلوم کرانا بے ضرورت تھا، پس لامحالہ ماننا پڑے گا کہ تعلیم کی دوسری ہی صورت مراد ہے، چنانچہ قرآن کریم

---

[1] بقرہ، پارہ ۱

نے اسی مضمون کو ذیل کی آیتوں میں بیان کیا ہے۔

① ﴿وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ﴾ [1]

تَرجَمَہ: ''اور نہیں نازل کی ہم نے کتاب مگر اس لئے کہ آپ بیان کریں ان لوگوں کے لئے۔''

② ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾ [2]

تَرجَمَہ: ''اور نازل کیا ہم نے آپ کے پاس ذکر (کتاب) کو تا کہ کھول کھول کر بیان کریں لوگوں کے واسطے اس چیز کو جو نازل کی گئی ان کی طرف اور تا کہ وہ غور وفکر کریں۔''

اور اس تعلیم و تبیین کی ضرورت اسی لئے پیش آئی کہ قرآن کریم میں عبادات و معاملات اور اخلاق و معاشرت وغیرہ کے صرف اصول اور کلی قوانین مذکور ہیں اور ان اصول وکلیات سے ان کے فروع وجزئیات کا استنباط واستخراج ہر شخص کے لئے ممکن نہ تھا بلکہ بعض جزئیات تک تو کسی شخص کی بھی رسائی ممکن نہ تھی، بجز اس ذات مقدس کے جس کا سینہ انوار وحی کا مخزن اور جس کا قلب تجلیات ربانی کی منزل ہو۔

رسول اللہ ﷺ کا مخصوص فہم قرآن

میرے اس بیان میں اس شخص کو تو کوئی شک نہیں ہو سکتا جس کا دل مرتبہ رسالت کی عظمت وجلالت کے اعتقاد سے لبریز ہے، لیکن جو شخص اس ایمانی کیفیت سے ناآشنا ہو، میں اس سے کہتا ہوں کہ یہ تو بالکل بدیہی ہے کہ قرآن کریم کا کچھ نہ کچھ فہم تو ہر اس شخص کو عطا ہوا ہے جو عربی زبان کا حرف شناس ہے اور یہ بھی بدیہی ہے کہ اس فہم کے مراتب ودرجات متفاوت ومختلف ہیں، رات دن کا مشاہدہ ہے کہ

---

[1] پارہ ۱۴ ع ۱۳

[2] پارہ ۱۴ ع ۱۱

ایک آیت کو ہم بار بار پڑھتے ہیں اور سینکڑوں دفعہ ہماری نظر سے گزرتی ہے اور اس سے کسی خاص نکتہ کی طرف ہمارے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی لیکن ایک دوسرا شخص بیک نظر اس سے کوئی بہت نفیس علمی نکتہ اخذ کر لیتا ہے پس جب ایک امتی کو دوسرے امتی پر فہم قرآنی میں یہ تفوق حاصل ہو سکتا ہے اور حاصل ہے تو کیا خود اس کو جس کے قلب پر قرآن نازل ہوا، اور جس کا سینہ بالقائے ربانی اس وحی آسمانی سے معمور ہوا اس کو سب امتیوں پر فہم قرآن میں کوئی تفوق و امتیاز خاص حاصل نہ ہوگا؟! میں تو یہی کہوں گا کہ کوئی مسلمان اس کا جواب نفی میں دینے کی جرأت نہیں کر سکتا، اور کیسے جرأت کر سکتا ہے جب کہ قرآن کریم خود ہی بتا رہا ہے کہ اس کے معلم ﷺ کو منجانب اللہ فہم قرآن کے بارے میں ایک خاص بصیرت اور سوجھ بوجھ عطا کی گئی تھی جس کی بنا پر آپ کو لوگوں کے درمیان حکم مطلق کی حیثیت نوازش کی گئی تھی خدا فرماتا ہے۔

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ
أَرَىٰكَ ٱللَّهُ﴾[1]

ترجمہ: ”بے شک ہم نے نازل کیا آپ پر کتاب کو تا کہ آپ فیصلہ کریں لوگوں کے درمیان اس چیز کے ساتھ کہ اللہ آپ کو دکھائے اور سوجھائے۔“

یہ آیت صراحۃً بتا رہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو کتاب اللہ کا خاص فہم اور خاص سوجھ اور سمجھ عطا کی گئی تھی تا کہ آپ اس کے ذریعے سے قرآنی احکام کے ماتحت لوگوں کے جھگڑے چکائیں اور فیصلے فرمائیں۔

فہم قرآن کے لئے شرح رسول کی روشنی درکار ہے

ان بیانات سے خوب واضح ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ قرآن کریم کے معلم اور

---

[1] نساء پ ۵

شارح ومبین تھے اور آپ کی شرح وتبیین اور تعلیم اس بصیرت کی روشنی میں ہوتی تھی جو خاص آپ کو منجانب اللہ عطا ہوئی تھی اور چونکہ۔

ع این دولت و سرمد ہمہ کس را ندہند

یعنی یہ بصیرت خاصہ آپ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے اس لئے ہر امتی کو قرآن کریم کے باریک معانی ودقیق مطالب اور اس کے غوامض ودقائق تک رسائی حاصل کرنے کے لئے حضرت شارح قرآن علیہ السلام کی شرح وتبیین کی روشنی درکار ہوگی، چنانچہ خدا نے اس کو بھی قرآن کریم میں بیان کیا۔

﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ [1]

ترجمہ: ”بہ تحقیق تمہارے پاس اللہ کی جانب سے ایک نور (مجسم) اور ایک روشن کتاب آئی ہے۔“

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے کتاب مبین سے پہلے ایک نور کا ذکر فرمایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب مبین کے معانی ومطالب تک رسائی بدوں اس نور خاص کے ممکن نہیں، اور ہر وہ شخص جو کتاب مبین کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اور اس پر عمل کرنے کا شوق رکھتا ہے، اس کو اس نور کی روشنی میں کتاب اللہ کا مطالعہ کرنا چاہئے، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ نور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدس سے عبارت ہے پس ثابت ہوگیا کہ کتاب اللہ کی مراد سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں آنحضرت ﷺ کی قولی وعملی شرح سے کوئی مسلمان بے نیاز نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے بغیر یہ دونوں باتیں ممکن ہی نہیں۔

آنحضرت ﷺ کی شرح قرآن ہی کا نام حدیث وسنت ہے

جب یہ بات بخوبی ذہن نشین ہوگئی کہ قرآن کریم کے معلم وشارح علیہ السلام نے

---

[1] پ ۶ ع ۶

قرآن کریم کی جو شرح وتبیین فرمائی ہے وہ خدا کی دی ہوئی بصیرت اور روشنی میں کی ہے اور صرف یہی نہیں کہ اس شرح سے کوئی مسلمان بے نیاز نہیں ہو سکتا بلکہ اس سے بے نیازی برت کر کوئی مسلمان خود قرآن کریم پر عمل نہیں کر سکتا اور نہ اس کے حقیقی مفہوم و مراد تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، تو اب یہ ماننے میں آپ کو کیا تامل ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کے ساتھ ساتھ اس کی وہ شرح وتبیین بھی جو اس کے شارح ومبین علیہ السلام نے فرمائی ہے، ہر مسلمان کے لئے واجب التسلیم ہے، اور قرآن کے بعد دین متین محمدی اور شریعت اسلامیہ کا وہ ستون ہے جس پر یہ سربفلک عمارت قائم ہے۔

قرآن کریم کی اس شرح وتبیین اور قولی وعملی بیان کا نام حدیث وسنت ہے، اگرچہ مذکورہ بالا بیان کے بعد کسی طالب حق کو حدیث وسنت کے واجب التسلیم ہونے میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی تاہم مزید اطمینان کے لئے اس مسئلہ پر قرآن کریم ہی سے مزید روشنی ڈالی جاتی ہے۔

حجیت حدیث کے اور دلائل

قرآن کریم کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم نے جس طرح آنحضرت ﷺ کی رسالت کی تصدیق او آپ کی نبوت پر ایمان لانے کی پر زور دعوت دی ہے اسی طرح ایک اور بات کا بھی نہایت موکد حکم دیا ہے اور اس کو کہیں "اطاعت رسول" کے عنوان سے ذکر کیا ہے اور کہیں اس کی تعبیر رسول کو "حکم مطلق" ماننے سے کی ہے پہلے مضمون کے لئے حسب ذیل آیتوں کو غور سے پڑھنا چاہئے۔

❶ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ
عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ
وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا

بَعِیْدًا ۝﴾ [1]

ترجمہ: ''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری، اور جو انکار کرے گا اللہ کا اور ملائکہ کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور پچھلے دن کا تو وہ دور کی گمراہی میں پڑ گیا۔''

② ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ یُؤْتِیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ﴾ [2]

ترجمہ: ''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر اور ان میں کوئی تفریق نہ کی وہ لوگ ہیں کہ عنقریب اللہ ان کو ان کے اجر دے گا۔''

③ ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَیْرًا لَّكُمْ ؕ﴾ [3]

ترجمہ: ''اے لوگو! بے شک تمہارے پاس حق کے ساتھ رسول آیا پس ایمان لاؤ اسی میں تمہارے لئے بھلائی ہے۔''

④ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ [4]

ترجمہ: ''مومن بس وہی ہیں جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور اس کے رسول پر۔''

⑤ ﴿وَمَنْ لَّمْ یُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ سَعِیْرًا ۝﴾ [5]

ترجمہ: ''اور جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لائے تو ہم نے

---

[1] پ ٥ ع ١٦
[2] پ ٦ ع ١
[3] پ ٦ ع ٣
[4] پ ٢٦ ع ١٣
[5] پ ٢٦ ع ٩

منکروں کے لئے دہکتی ہوئی آگ تیار کی ہے۔"

اور دوسرے مضمون کے لئے آیات ذیل سامنے رکھنی چاہئیں۔

① ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ۝﴾[1]

ترجمہ: "اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔"

② ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾[2]

ترجمہ: "اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اگر تم ایمان والے ہو۔"

③ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝﴾[3]

ترجمہ: "اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اور مت پھیرو اس سے دراں حالیکہ تم سنتے ہو۔"

④ ﴿وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾[4]

ترجمہ: "اور وہ مومن اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں۔"

⑤ ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا﴾[5]

ترجمہ: "اور فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول کی اور ڈرو اس کی مخالفت سے۔"

⑥ ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾[6]

ترجمہ: "جس نے حکم مانا رسول کا تو شبہ نہیں کہ اس نے اللہ کا حکم مانا۔"

---

[1] پ ٢٦ ع ٧
[2] پ ٩ ع ١٥
[3] پ ٩ ع ١٦
[4] پ ١ ع ١٤
[5] پ ٧ ع ٢
[6] پ ٥ ع ٧

۷ ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا ۝﴾[۱]

تَرجَمۂ: ”اور جب کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کی طرف جس کو خدا نے نازل کیا اور (آؤ) رسول کی طرف تو دیکھو گے (اے رسول) منافقوں کو کہ منہ پھیرتے ہیں تم سے منہ پھیرنا۔“

۸ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ﴾[۲]

تَرجَمۂ: ”اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور اپنے میں سے امر والوں کا پس اگر جھگڑو تم کسی بات میں، تو لوٹاؤ اس کو اللہ اور رسول کی طرف۔“

۹ ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝﴾[۳]

تَرجَمۂ: ”پس قسم ہے آپ کے پروردگار کی کہ وہ مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ (اے رسول ﷺ) ان کے آپس میں جو نزاع واقع ہو، اس میں آپ کو حکم نہ بنائیں، پھر نہ پائیں اپنے دلوں میں کوئی تنگی تمہارے فیصلے سے اور پورا پورا تسلیم کر لیں۔“

۱۰ ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا ۝﴾[۴]

---

[۱] پ ۵ ع ۵ [۲] پ ۵ ع ۵ [۳] پ ۵ ع ۶ [۴] پ ۲۲ ع ۱

ترجمہ: ”کسی ایمان والے مرد یا عورت کو حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول کوئی حکم دے دیں تو ان کو اپنے معاملہ کا اختیار باقی رہے، اور جو نافرمانی کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول کی تو وہ بے شبہ کھلا گمراہ ہو گیا۔“

دونوں قسم کی آیتیں آپ کے سامنے ہیں، پہلی قسم کی آیتوں میں جس طرح خدا، ملائکہ، کتاب اللہ اور قیامت پر ایمان لانے کا حکم ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی تاکید ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اعتقاد اور آپ کے مبعوث من جانب اللہ ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے، اور دوسری قسم میں اس کے سوا ایک دوسری بات کا حکم ہے اور وہ یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے احکام کو تسلیم کرنا ضروری ہے، اسی طرح رسول کی فرمانبرداری اور آپ کے احکام کی تعمیل بھی ضروری ہے یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کتاب اللہ میں مذکور ہیں، لہٰذا اس کی اطاعت وفرمانبرداری سے مراد یہ ہے کہ اس کی کتاب کو دستور العمل بنایا جائے لیکن غور طلب یہ چیز ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری اور اس کے احکام کی تعمیل سے کیا مراد ہے، اگر کہیے کہ وہی کتاب اللہ کی پیروی تو میں کہوں گا کہ یہ بات تو پہلے فقرہ میں آ چکی ہے، لہٰذا ایک ہی بات کو دو عنوانوں سے ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر یہ ایک جگہ نہیں، بلکہ مذکورہ بالا سب آیتوں میں اور ان کے سوا دوسری صدہا آیتوں میں بھی یونہی ہے، تو کیا ہر جگہ یہی کہہ دیا جائے گا کہ دوسرے فقرے میں بھی پہلی ہی بات دہرا دی گئی ہے قرآن کریم کے معجزانہ ایجاز کو پیش نظر رکھتے ہوئے تو کوئی صاحب عقل یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اور اگر یہ تاویل بارد "اطیعوا اللہ و رسولہ" یا اس قسم کی دوسری آیتوں میں چل بھی جائے تو آیت نمبر ۹ میں کیا تاویل کی جائے گی؟ اس میں تو اطیعوا

اللہ کا فقرہ موجود ہی نہیں بلکہ اس میں تو اتنا مذکور ہے کہ کوئی اس وقت تک مؤمن ہی نہیں ہو سکتا جب تک اپنی جملہ نزاعات اور اپنے تمام اختلافات میں نبی عربی ﷺ کو اپنا حَکَم اور فیصلہ کن نہ قرار دے کہ آپ کے فیصلہ سے اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کرے بتایئے کیا یہاں بھی یہی کہے گا کہ آنحضرت ﷺ کو حَکَم ماننے سے مراد کتاب اللہ کو حَکَم ماننا ہے؟

اگر کوئی صاحب یہ جرأت کرنے کے لئے آمادہ ہوں تو بتائیں کہ اس کے لئے ان کے پاس کون سی دلیل ہے؟ پھر یہ بھی بتائیں کہ اگر یہی مراد تھی تو یحکموک کی بجائے یحکموا کتاب اللہ کہنے میں کیا نقصان تھا؟

بہرحال آیات مذکورۃ الصدر سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی فرمانبرداری اور کتاب اللہ کی پیروی کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری اور احکام رسول (ﷺ) کی تعمیل بھی ضروری ہے اور یہ کہ رسول اللہ (ﷺ) کو اپنے ہر اختلاف میں حَکَم مطلق ماننا مدار ایمان ہے، اور ہم احکام رسول (ﷺ) اور آپ کے فیصلوں ہی کو ''حدیث'' کہتے ہیں پس حدیث رسول ﷺ کے واجب التسلیم ہونے میں اب کون سا شبہ باقی رہ گیا۔

کیا آنحضرت ﷺ کے بست و سہ سالہ عہد رسالت میں مسلمانوں کے درمیان کبھی کوئی اختلاف واقع نہیں ہوا، کیا اس طویل مدت میں آپ کے روبرو کوئی مقدمہ پیش نہیں ہوا، اگر ہوا (اور بہت ہوا) تو بتایا جائے کہ ان اختلافات و مقدمات میں جو فیصلے دربار رسالت سے صادر ہوئے ان کا کیا نام ہے، اور وہ کہاں ہیں؟

اگر کوئی بدبخت یہ کہے کہ وہ سارے فیصلے مسلمانوں کی بے اعتنائی سے نذر حوادث ہو گئے اور آنحضرت ﷺ کا ایک فیصلہ بھی دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا تو یہ اسلام کی تاریخ پر نہایت ناپاک حملہ ہے، اور ایسا شخص مسلمانوں کا بدترین دشمن ہے۔

رسول علیہ السلام کی حرام کی ہوئی اشیاء بھی اسی طرح حرام ہیں جس طرح خدا کی حرام کی ہوئی

اس کے بعد قرآن کریم کی ایک اور آیت کی طرف بھی میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب اللہ میں جو چیزیں حرام کی ہیں ان کے علاوہ اور کچھ چیزیں بھی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے اور ان چیزوں کو حرام سمجھنا اور ان کے استعمال سے بچنا اسی طرح ضروری اور واجب ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی اشیاء سے، ارشاد ہوتا ہے۔

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾[1]

ترجمہ: ”لڑو ان لوگوں سے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے، حرام نہیں قرار دیتے۔“

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرام کی ہوئی چیزیں کون کون سی ہیں اور ان کے معلوم کرنے کے ذرائع کیا ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ چیزیں بجز اس چیز کے جس کو ہم ”حدیث“ کہتے ہیں اور کہیں سے معلوم نہیں ہو سکتیں، پس معلوم ہوا کہ احادیث میں جن اشیاء کی حرمت مذکور ہے ان کو حرام نہ سمجھنا بلکہ پورے ذخیرہ احادیث کو بے کار موضوع اور بناوٹی کہنا درحقیقت اس آیت اور آیات سابقہ کا انکار کر دینا ہے۔

اس مقام پر میں ابوداؤد و ابن ماجہ کی ایک حدیث نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جس کو اس آیت کی شرح کہنا بے جا نہ ہوگا، اس حدیث کے پڑھنے کے بعد علماء

---

[1] پ ۱۰ ع ۱۰

محققین کی اس تحقیق کی صداقت آئینہ ہو جائے گی کہ احادیث نبویہ درحقیقت قرآن کریم کی شرحیں ہیں اور اس سے ماخوذ ومستنبط ہیں وہ حدیث یہ ہے۔

''یوشك الرجل متكئا علی اریكته یحدث بحدیث من حدیثی فیقول بیننا وبینكم كتاب اللّٰه فما وجدنا فیه من حلال استحللناه وما وجدنا فیه من حرام حرمناه الا وان ما حرم رسول اللّٰه مثل ما حرم اللّٰه.''

تَرجَمہ: ''وہ زمانہ قریب ہے جب کہ ایک آدمی اپنے تخت پر بیٹھا ہوگا، اور اس سے میری کوئی حدیث بیان کی جائے گی، تو وہ کہے گا کہ ہمارے تمہارے درمیان کتاب اللہ موجود ہے اس میں جو حلال ہو ہم اس کو حلال سمجھیں گے اور جو حرام ہو اس کو حرام لیکن تم آگاہ رہو کہ جن اشیا کو رسول اللہ ﷺ نے حرام کیا وہ بھی انہی کی طرح ہیں جن کو اللہ نے حرام کیا۔''

آنحضرت ﷺ کی تحلیل وتحریم کا ذکر قرآن کی دوسری آیت میں

قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں آنحضرت ﷺ کی تحلیل وتحریم دونوں کا ذکر موجود ہے اور ظاہر ہے کہ ان دونوں امور میں آپ کے اتباع کی دعوت کے علاوہ اس ذکر کا کوئی مقصود نہیں ہو سکتا، ارشاد ہے۔

﴿ویحل لهم الطیبات ویحرم علیهم الخبائث ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی كانت علیهم.﴾[1]

تَرجَمہ: ''اور رسول (ﷺ) امی لوگوں کے لئے پاکیزہ اشیاء کو حلال اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں اور ان سے اس بوجھ اور ان

---

[1] پ ۹ ع ۹

پھانسیوں کو جوان پر پہلے تھیں اتارتے ہیں۔"

آنحضرت ﷺ کے افعال کی پیروی کا حکم بھی قرآن نے دیا ہے

اقوال تو اقوال قرآن کریم نے آنحضرت ﷺ کی ایک ایک ادا کی پیروی کرنے کی بھی دعوت دی ہے، ارشاد ہوا "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ." (یعنی) تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات مقدس میں بہتر پیروی کی باتیں ہیں، آنحضرت ﷺ کے انہی اعمال اور افعال کو جن کی پیروی کا حکم آیات بالا میں ہے، "ہم سنت" کہتے ہیں، اس پورے بیان کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کے علاوہ آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال بھی قابل عمل واجب التسلیم اور حجت ہیں اس مضمون کو خود قرآن کریم نے مختلف عنوانوں سے بیان کیا ہے ساڑھے تیرہ سو برس سے تمام مسلمانوں کا یہی عقیدہ یہی خیال اور بالاتفاق سب کا اسی پر عمل تھا اور ہے۔

انکار حدیث

لیکن چند دنوں سے ہندوستان میں کچھ افراد ایسے پیدا ہوگئے ہیں جو مسلمانوں کے اس قدیم اجماعی عقیدے کو غلط اور افعال و اقوال نبوی ﷺ کی پابندی کو غیر ضروری بتاتے ہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ ان عملی ذخیروں کو جو اقوال و افعال نبوی پر حاوی ہیں، مغربیت کی پوٹ اور مصنوعی و خود تراشیدہ افسانوں کا مجموعہ قرار دیتے ہیں، اور بالکل صاف صاف یہ کہ احادیث نبویہ کے قابل عمل و لائق اعتبار ہونے سے انکار کرتے ہیں، جہاں تک غور کیا گیا، لامذہبیت کے سوا اور کوئی علت انکار حدیث کی معلوم نہیں ہوتی، اس کا راز صرف یہ ہے کہ انکار حدیث کے بعد ان کی ملحدانہ تگ و دو کے لئے میدان نہایت وسیع اور ہموار ہو جائے گا، مذہبی پابندیاں یکسر

نیست و نابود ہو جائیں گی، یا بدرجۂ اقل صرف نام کو رہ جائیں گی، ایک قرآن رہ جائے گا، اس کے معنی و مفہوم میں اپنی رائے و قیاس سے جو تصرف و تحریف کرنا چاہیں گے، پوری آزادی سے کرسکیں گے، اگر کسی نے ٹوکا کہ یہ مفہوم احادیث یا تفاسیر کے خلاف ہے تو نہایت صفائی سے کہہ دیا جائے گا، کہ وہ مفہوم اگر راوی اور مفسر نے اپنی سمجھ سے بیان کیا ہے، تو ہم اس کے پابند نہیں ہیں، اور اگر حدیث نبوی کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے تو حدیث قابل اعتبار و استناد نہیں ہے، چلئے قصہ ختم ہوا، اب جس آیت کا جو مفہوم چاہے قرار دے لیجئے، کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا، یہ خیالات نہیں ہیں بلکہ واقعات ہیں، منکرین حدیث کے جس مضمون یا رسالہ میں چاہیں اس کی مثالیں مل سکتی ہیں، ایسی بعض مثالیں میں آگے ذکر بھی کروں گا؟

میں نے منکرین حدیث کے انکار کی جو علت ذکر کی ہے حقیقی علت تو وہی ہے لیکن اس علت کے اظہار کے بعد کون بے خرد مسلمان ہوگا، جو ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی خرافات کو سن سکے اور ان کے دام فریب میں آسکے، اس لئے اس پر پردہ ڈالنے کے لئے دوسری دور از کار علتیں تراشی جاتی ہیں اور اگرچہ ان علتوں کی سخافت و کمزوری بھی بہت کھلی ہوئی ہے تاہم بعض ناواقف مسلمان منکرین حدیث کے ملمع کارانہ بیان سے دھوکہ میں آجاتے ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ مختصر طور پر کچھ ان کی نسبت بھی لکھ دوں۔

منکرین حدیث کے وسوسوں کا دفعیہ

انکار حدیث کی جو علتیں ذکر کی جاتی ہیں، یا کی جاسکتی ہیں، ان کو علت کہنا علت کی توہین ہے، اس لئے میں بجائے علت کہنے کے وسوسہ سے تعبیر کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ حسب ذیل وسوسے انکار حدیث کے باعث بن سکتے ہیں۔

پہلا وسوسہ: اقوال وافعال نبوی (ﷺ) کی پیروی کا خدا نے حکم ہی نہیں دیا اس کا تفصیلی رد آپ سن چکے اور معلوم کر چکے کہ اقوال وافعال نبوی ﷺ کے واجب التسلیم قابل پیروی ہونے کا منکر قرآن کی صدہا آیات کا منکر ہے۔

دوسرا وسوسہ: اقوال وافعال نبوی ﷺ قابل پیروی تو ہیں لیکن ان کا کہیں وجود نہیں ہے مسلمانوں کی بے اعتنائی سے ایک قول یا ایک فعل کی نقل وحکایت بھی محفوظ نہ رہی مسلمانوں نے اس کی نقل وحکایت کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔

اس کا جواب: یہ ہے کہ ایسی بدیہی ومتواتر بات کا انکار جس کا اعتراف غیر مسلموں کو بھی ہے، محل تعجب ہے یہ بات تواتر کے اعلیٰ درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ جو مسلمان آنحضرت ﷺ کی صحبت سے شرف اندوز ہوئے انہوں نے آپ کے جملہ اقوال وافعال کی حفاظت کا ایسا اہتمام کیا جس کی نظیر کوئی دوسری قوم پیش نہیں کر سکتی، زبانی یادداشت کے علاوہ تحریری یادداشت کا بھی انتظام کیا، جیسا کہ مقدمہ میں پورے شرح وبسط کے ساتھ بتایا جا چکا ہے پھر اس امانت کو پورے احتیاط کے ساتھ انہوں نے تابعین کے حوالہ کیا اور تابعین نے اس کو تبع تابعین تک پہنچایا، اس عہد میں زبانی روایات کا سلسلہ تو جاری ہی رہا تصنیف وتالیف بھی شروع ہوگئی چنانچہ اس عہد کا ایک مجموعہ اقوال وافعال نبوی آج بھی دنیا کے ہر گوشہ میں مؤطا کے نام سے موجود ہے اور اس کے بعد تو بکثرت ایسے مجموعے تیار ہوئے جس کو مسلمانوں نے اصولی طور پر بلا رد وقدح قبول کیا، اور آج تک برابر قبول کرتے آئے چنانچہ یہ مجموعے آج بھی نہایت کثیر تعداد میں موجود ہیں تو کیا ان کے وجود سے انکار کر دینا آفتاب کے وجود سے انکار کے مرادف نہیں ہے؟

غیر مسلموں کی شہادتیں

میں نہیں سمجھتا کہ یہ منکرین ایسی متواتر چیز کا کس طرح انکار کر سکتے ہیں جس کا

اعتراف متعصب سے متعصب یوروپین مصنفین کو بھی ہے، حالانکہ منکرین ان کی کسی بات کو وحی سے کم تصور نہیں کرتے منکرین کو سوچنا چاہیے کہ صرف مسلمان ہی اس کے قائل نہیں ہیں کہ اقوال و افعال نبوی ﷺ محفوظ ہیں، بلکہ غیر مسلم مورخین بھی اس کے مقر و معترف ہیں، چنانچہ مشہور روسی فیلسوف ٹالسائی نے آنحضرت ﷺ کے چند حکیمانہ اقوال زریں کا ترجمہ روسی زبان میں شائع کیا ہے اور مشہور مورخ ایڈورڈ گبن نے تاریخ زوال روم (جلد ۵ باب ۵۰) میں لکھا ہے ”ہر ایک بانی مذہب کی سیرت سے اس کے تحریری مکاشفات کی تکمیل ہوتی ہے، چنانچہ (حضرت) ﷺ کی حدیثیں امر حق کی جامع نصیحتیں اور ان کے افعال مجسم نیکی کے نمونے ہیں“ اگر اقوال و افعال نبویہ ”علی صاحبها الصلوة والتحیة“ کا کوئی ذریعہ علم دنیا میں موجود نہیں تو ٹالسائی کس کے اقوال کا ترجمہ شائع کرتا ہے، اور گبن کس کے اقوال و افعال کو جامع نصیحت اور مجسم نیکی کا نمونہ بتا رہا ہے۔

مسلمانوں کا ناز خاک میں مل جائے گا

مسلمانوں کو تمام دنیا کے مقابلہ میں ناز اور بجا ناز تھا کہ اسلام کی تاریخ سے زیادہ مکمل تاریخ کسی مذہب کی نہیں ہے اور داعی اسلام کے حالات زندگی ان کے افعال و اقوال وغیرہ جتنی تفصیل و تکمیل کے ساتھ مسلمان پیش کر سکتے ہیں، دنیا کا کوئی دوسرا مذہب اپنے داعی کی نسبت اس کا ہزارواں حصہ بھی پیش کرنے سے عاجز ہے مسلمانوں کے پاس ان کے رسول ﷺ کی زندگی کے معمولی سے معمولی واقعہ اور جزئی سے جزئی حالت کی نہایت مستند نقل موجود ہے مسلمانوں کے پاس ان کے نبی ﷺ کی خوراک و پوشاک نشست و برخاست نقل و حرکت غرض ہر چیز کا بیان موجود ہے، لیکن منکرین حدیث نے حدیث کا انکار کر کے مسلمانوں کا یہ فخر و ناز بھی خاک میں ملا دیا۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اگست ۲۹ء کے معارف میں بہت خوب لکھا ہے کہ۔

> ”اسلام کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے کہ اس نے اپنے رسول ﷺ کے ایک ایک واقعہ ایک ایک قول اور ایک ایک حکم کو دنیا میں محفوظ رکھا اور ان کے لئے متعدد اصول اور فن ایجاد کئے، مگر اگر اسلام کے ان نئے محسنوں (یعنی منکرین حدیث) کے خیالات مان لئے جائیں تو یہ کارنامہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے لعنت بن جائے گا، اور صحابہ سے لے کر آج تک وہ تمام اخیار واکابر امت جن کی زندگیوں پر آج نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کو ناز ہے وہ سب کے سب راست بازی اور صداقت کی بارگاہ سے راندہ نکلیں گے، کیا یہ اسلام پر احسان ہے؟ آنحضرت ﷺ کے بعد سے لے کر آج تک خلفائے راشدین تابعین ائمہ مجتہدین علمائے خیر تمام کے تمام اپنے استنباطات اور اجتہادات میں قرآن پاک کے بعد احادیث اور اقوال نبوی کی تقلید واتباع کرتے رہے ہیں، لیکن آج سے یہ لازم آئے گا کہ یہ سب کے سب نعوذ باللہ مشرک انسان پرست اور کتاب اللہ کے تارک تھے، اور آج جو نئے مفسر اور نئے فقیہ بنے ہیں ان کے اقوال واجتہادات واستنباطات کے سننے والے سچے موحد سچے دیندار اور کتاب اللہ کے سچے پیروکار ثابت ہوں اس کے بعد یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ کا مشن سخت ناکام رہا اور تیرہ سو برس تک اسی طرح ناکام رہا، یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک قطعہ میں کتاب اللہ کے چند ماہرین اسرار پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے اصل اسلام کو دنیا میں آشکارا کیا اور وہ کام کیا، جو نہ خود رسول اللہ (ﷺ) نے نہ ابوبکر صدیق ؓ نے کیا، نہ عمر فاروق ؓ نے کیا نہ علی مرتضی ؓ

> نے کیا، نہ دوسرے صحابہ اور تابعین نے کیا اور نہ دوسرے ائمہ مجتہدین سے ہو سکا، پھر ہمیں کوئی بتائے کہ قرآن کی عملی تصویر دنیا میں کبھی جلوہ گر تھی یا نہیں، اگر تھی تو وہ کب؟ اور اس کی تاریخ کہاں ملے گی؟ اور اگر نہ تھی تو قرآن سے زیادہ ناکام صحیفہ آسمانی دنیا میں اور کون ہوگا، کیا کسی مسلمان کی غیرت اسلامی اس خیال کو جائز رکھتی ہے۔''

مسلمانانِ سلف پر سخت حملہ

اگر احادیث کا یہ سارا ذخیرہ بے اعتبار مصنوعی اور بناوٹی ہے تو میں منکرین حدیث سے پوچھتا ہوں کہ کیا جس وقت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مثلاً موطا میں بزعم منکرین حدیث رسول پاک ﷺ پر افتراء پردازیاں کیں، اور رسول کریم ﷺ و اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کی طرف جھوٹی جھوٹی باتیں منسوب کیں، اسلام کے عین مرکز میں اور اس سرزمین میں جہاں رسول کریم ﷺ آرام فرما ہیں اور وہاں بھی خاص اس مسجد محترم میں جو دس برس تک درس گاہ نبوت اور سجدہ گاہ رسول خدا (ﷺ) رہ چکی تھی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان مفتریات واکاذیب کا مجموعہ درس دینا شروع کیا، اور اس درس میں اندلس، مصر، شام، کوفہ، بصرہ اور بلاد عجم تک کے علماء شریک ہوئے اور اس مجموعہ کی روایت وسماع بلکہ ان کی نقلیں حاصل کر کے اطراف عالم میں پھیل گئے اور اس مجموعہ کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا، تو اس وقت کوئی ہمدرد اسلام کوئی حقیقی مسلمان بلکہ کوئی غیرت مند انسان ایسا نہ تھا جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی اس نازیبا کاروائی کے خلاف لب کشائی کرنے کی جرأت کرتا، اور مسلمانوں کو ان کے فریب سے بچاتا، اور ان افتراء پردازیوں کی روک تھام کرتا، درصورتیکہ یہ روک تھام اور افتراء پردازیوں کی پردہ دری کچھ مشکل بھی نہ تھی، اس لئے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے موطا میں جو روایتیں جمع کی ہیں ان کی نسبت یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ انہوں نے ان کو فلاں

فلاں علماء سے سنا ہے اور تصنیف مؤطا کے وقت ان میں سے بہت سے علماء بقید حیات موجود تھے لہٰذا امام مالک کے خلاف ان علماء کی شہادتیں حاصل کر کے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی غلط بیانیوں کا راز نہایت آسانی سے فاش کیا جا سکتا تھا لیکن کسی نے ایسا نہ کیا ایک آواز بھی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مخالفت میں نہ اٹھی کسی عالم نے بھی ان کو افتراء پرداز اور غلط گو نہ کہا ممکن ہے منکرین حدیث بول اٹھیں کہ مؤطا کی تصنیف حکومت کی سرپرستی میں ہوئی ہے، اس لئے حکومت کے خوف سے کوئی نہیں بولا لیکن یہ جہالت کا بدترین نمونہ ہوگا، اس لئے کہ تاریخیں شاہد ہیں کہ اس زمانہ کے اہل علم حکومتوں کے خوف سے حق گوئی سے کبھی باز نہ رہتے تھے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بعد خود امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حکومت نے ان حضرات کے ساتھ انتہائی جبر و تشدد سے کام لیا مگر ان حضرات نے اپنی تحقیق کے خلاف لب نہ ہلایا مہربانی فرما کر منکرین حدیث علمائے سلف کو اپنے اوپر قیاس نہ کریں۔

علاوہ بریں یہ بالکل تاریخی بات ہے اور تاریخوں میں بہ سرپرستی حکومت مؤطا کے تصنیف ہونے کا کوئی ضعیف سے ضعیف ثبوت بھی نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ تصنیف مؤطا کے بعد بادشاہ وقت نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ آپ شاہی محل میں شہزادوں کو مؤطا کا درس دے جایا کریں تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ جس کو علم کی طلب ہو، اس کو عالم کی خدمت میں خود حاضر ہونا چاہئے اگر امام مالک نے حکومت کی سرپرستی میں کتاب لکھی ہوتی اور حکومت کی رضامندی ہی اس تصنیف کی غرض و غایت ہوتی تو خود اپنی عقل سے سوچو کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ یہ جواب بادشاہ وقت کو ہرگز نہیں دے سکتے تھے امام مالک سے پہلے حدیث کے جو مجموعے تیار ہوئے مثلاً ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۵۰ھ اور ابن عروبہ رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۵۶ھ اور ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۴ھ نے حدیث کی جو کتابیں لکھی تھیں ان کے لکھنے کے وقت میں بھی کسی مسلمان نے ان کی کارروائیوں

پر اظہار نفرت نہ کیا نہ کسی نے ان کی مخالفت کی حالانکہ ان کے وقت میں تو خود صحابہ کرام بھی موجود تھے لیکن کیا منکرین حدیث کسی تاریخ سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ کسی صحابی نے ان کی تکذیب کی ان کو مفتری کہا اور ان کی غلط بیانیاں ظاہر کیں؟ اور اگر اس وقت نہیں تو کیا اس کے بعد چودہویں صدی تک ان مصنفین حدیث کی افتراء پردازیوں کی حقیقت جو اس صدی میں منکرین حدیث پر منکشف ہوئی کسی اور مسلمان پر بھی منکشف ہوئی؟ اگر نہیں منکشف ہوئی تو مسلمانوں سے زیادہ گمراہ اور جاہل قوم دنیا میں کوئی نہ گزری ہوگی، کہ یہ قوم ساڑھے گیارہ سو برس تک ایک چیز کو اصول دین میں سے سمجھتی رہی اور اس طویل مدت میں کسی کو اپنی غلطی کا احساس نہ ہوا استغفر اللہ کون باحمیت مسلمان ہوگا جو اس یاوہ گوئی کا تحمل کر سکے گا۔

منکرین حدیث کا یہ اقدام نہایت خطرناک ہے

پھر میں ان منکرین حدیث سے پوچھتا ہوں کہ اگر دوسری صدی کے نصف اول ہی میں (معاذ اللہ) مسلمانوں کی بے دینی و بے حمیتی اور ان کی ایمانی و اخلاقی کمزوری کا یہ حال ہو گیا تھا کہ رسول خدا ﷺ پر کچھ مسلمانوں نے افتراء پردازیاں کیں اور پے در پے کرتے رہے اور مسلمانوں کو قرآن کریم اور اس کی تعلیمات سے بے توجہ و بے پروا اور ناواقف بنانے کی تدبیریں عمل میں لاتے رہے اور دین قیم میں ہزاروں لایعنی باتیں ہزاروں خلاف قرآن عقائد و اعمال ہزاروں مخالف عقل و دور از کار افسانے داخل کرتے رہے اور ذات نبوی ﷺ پر سینکڑوں ناجائز تہمتیں تراشتے رہے اور سارے مسلمانان عالم ان شرم ناک حرکات کا خاموشی سے تماشا دیکھتے رہے کسی نے ان مفتریوں کے مقابلہ میں اپنی ایمانی و اخلاقی جرأت سے کام نہ لیا، اور کوئی رسول اللہ ﷺ کی عزت اور ناموس کی حفاظت اور قرآن کریم کی حمایت کے لئے کھڑا نہیں ہوا، اور شریعت مطہرہ میں اس قدر تحریفات ہوتے دیکھ کر

بھی کسی کی رگ حمیت نہ پھڑکی، تو اگر کوئی غیر مسلم آپ سے پوچھے کہ جب ان مسلمانوں کا یہی حال تھا تو کیا اطمینان ہے کہ قرآن کریم ان کے ناروا تصرفات سے سالم رہا ہوگا، اور کیا توقع ہے کہ ان مسلمانوں نے اس کو بجنسہٖ محفوظ رکھنے کے لئے کوئی کوشش کی ہوگی منکرین حدیث بتائیں کہ اس غیر مسلم کو وہ کیا جواب دیں گے!؟

انکارِ حدیث کا لازمی نتیجہ انکارِ قرآن ہے

منکرین حدیث خوب اچھی طرح غور کرلیں کہ ایسی متواتر چیزوں کے انکار اور ایسے تواتر کو بے اعتبار کردینے کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ ان کے ہاتھوں سے قرآن کریم بلکہ خود رسول خدا (ﷺ) کا دامن بھی چھوٹ جائے گا، اس لئے کہ ان سب چیزوں کے ثبوت کا مدار سوائے اخبار متواترہ کے اور کسی چیز پر نہیں ہے میں ہر چند غور کرتا ہوں لیکن کسی طرح یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ منکرین حدیث کو عقل وخرد سے اتنی بے گانگی کیوں ہے، آخر یہ کس عقل کا تقاضا ہے کہ کتب احادیث میں جو اقوال و افعال نبوی آنحضرت ﷺ سے لے کر ان کتابوں کے مصنفین تک مسلسل راویوں کے بیان و شہادت کے ذریعہ منقول ہوتے ہیں ان کو بے اعتبار و ناقابل قبول کہہ دیا جاتا ہے لیکن کتب تاریخ میں جو واقعات و حالات مذکور ہیں باوجودیکہ ان کی کوئی سند مذکور نہیں ہے۔ پھر بھی وہ سب مسلم و قبول ہیں۔

ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اور اس سے زیادہ بے خردی کا مظاہرہ یوں کیا جاتا ہے کہ یورپ کا ایک دشمن اسلام مصنف آنحضرت ﷺ کے ایک ہزار سال بعد پیدا ہوتا ہے اور محض اپنے قیاس و تخیل سے آنحضرت ﷺ یا قرآن یا اسلام یا حدیث یا کسی تاریخی واقعہ کے متعلق کوئی رائے ظاہر کرتا ہے تو ان مدعیان عقل کے نزدیک وہ ایسی تحقیقی بات ہو جاتی ہے کہ اس کو یہ وحی جبرئیل سے کم نہیں سمجھتے لیکن اخیار امت محمدیہ اور علمائے سلف امور مذکورہ کے عینی شاہدوں کا بیان باسناد متصل پیش کریں تو اصلاً ناقابل التفات اور

قطعاً غیر معتبر و نا قابل قبول۔

ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

تیسرا وسوسہ: جو انکار حدیث کا حیلہ بن جاتا ہے یہ ہے کہ حدیثوں میں بہت سی باتیں خلاف عقل ہیں اور خلاف عقل باتیں قابل تسلیم نہیں ہیں۔

اس کا جواب: یہ ہے کہ انکار حدیث کی یہ سب سے بھونڈی وجہ ہے منکرین حدیث کو اس وجہ کے ذکر کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ وہ عقل کا ایک خاص معیار پیش کرتے، اور اس معیار کا ثبوت قرآن کریم سے دیتے یا کم از کم اس معیار پر تمام یا اکثر عقلاء کا اتفاق پیش کرتے، یا یہ بھی نہیں تو اس معیار پر کوئی ایسی عقلی دلیل قائم کرتے جس سے اکثر منصف مزاج لوگ مطمئن ہو جاتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور نہ ایسا کوئی معیار پیش کرنا ان کے امکان میں ہے ہر واقف کار جانتا ہے کہ دنیا میں کوئی معیار عقل چند دنوں سے زیادہ قائم نہ رہ سکا فلسفہ قدیم اور فلسفہ جدید دونوں کی تاریخیں پڑھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ آج جو معیار عقل و دانش قرار دیا گیا، کل اس کو غلط اور لغو بتایا گیا ابھی کل تک جو چیزیں ناممکن سمجھی جارہی تھیں آج ہم ان کو اپنے مشاہدہ میں پاتے ہیں علاوہ بریں میں منکرین حدیث سے پوچھتا ہوں کہ عقل کو معیار رد و قبول قرار دینے میں کیا صورت اختیار کرتے ہیں، اگر وہ کچھ خاص نوعیت کے اشخاص کی عقلوں کو معیار بتاتے ہیں، تو ان کو بتانا ہوگا کہ کس نوعیت کے لوگوں کی عقلیں معیار ہوں گی اور اس نوعیت کی تخصیص کا کیا ثبوت ہے؟ اور اس خاص نوعیت کے اشخاص کی تعیین و انتخاب میں اختلاف ہوگا، تو اس کا فیصلہ عقل سے ہوگا یا نقل سے اگر عقل سے ہوگا تو پھر وہی سوالات ہوں گے اور اگر نقل سے ہوگا، تو وہ نقل کیا ہے اور اگر ہر شخص کی عقل معیار ہے تو گزارش ہے کہ جب ہر شخص اپنی عقل کے لحاظ سے مکلف ہے تو آپ حضرات نے یہ حماقت کیوں کی کہ اپنے خیالات و عقائد کا دوسروں کو پابند کرنے کے لئے رسالے نکالے مضامین چھپوائے اور کتابیں شائع کیں اگر کوئی شخص حدیثوں کو واجب التسلیم کہتا ہے، اور ان کے مضامین کو

خلاف عقل نہیں سمجھتا تو آپ کیوں حدیثوں کو خلاف عقل باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں منکرین حدیث نے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر حدیثوں کے انکار کے لئے ان کا یہی حیلہ کافی ہے تو حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا عذر خدا نے کیوں نہ مان لیا، آخر انہوں نے بھی تو تعلیمات شعیب علیہ السلام کے قبول کرنے سے اسی لئے انکار کیا تھا کہ یہ تعلیمات ہماری عقل میں نہیں آتیں ”قالوا یٰشعیبُ ما نفقه کثیراً مِمَّا تقول“ (اے شعیب تمہاری بہت سی باتیں ہم نہیں سمجھتے ہماری عقل میں نہیں آتیں) اسی طرح یہودیوں نے بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا ”قلوبنا غلف“ ہمارے دل بند ہیں اس میں آپ کی باتیں نہیں سماتیں یعنی آپ کی باتیں خلاف عقل وفہم ہیں منکرین حدیث کے اصول پر انکا عذر نہایت معقول تھا، مگر خدا نے اس عذر کی مطلق سماعت نہیں فرمائی، بلکہ ان کا یوں رد کیا ”بل لعنهم الله بکفر هم فقلیلا ما یؤمنون“ یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں خلاف عقل نہیں ہیں، بلکہ منکرین پر خدا نے ان کے انکار کی وجہ سے لعنت کر دی ہے، اب ان سے ایمان کی توقع بہت کم ہے، اسی طرح مشرکین نے بھی بہانہ نکالا تھا کہ ”قلوبنا فی اکنة مما تدعونا الیه“ (یعنی جس بات کی طرف ہم کو آپ دعوت دیتے ہیں ان کی نسبت ہمارے دل پردے میں ہیں) منکرین حدیث کے خیال سے تو یہ بڑی اٹل دلیل انکار رسول کی ہے مگر درحقیقت وہ ایسا لغو اعتراض کر کے مکذبین انبیاء علیہم السلام کے پیرو بن رہے ہیں، ”لبئس ما کانوا یعملون.“

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آج تک منکرین حدیث نے کوئی خلاف عقل حدیث پیش نہیں کی اور جن حدیثوں کو وہ خلاف عقل سمجھ کر پیش کرتے ہیں، درحقیقت وہ خلاف عقل نہیں ہیں بلکہ خود ان کی عقل نارسا کا قصور ہے، اس کے علاوہ ان احادیث کے مضامین اکثر و بیشتر قرآن کریم سے ثابت ہیں، مثلاً بہت سے عقل پرست حشر ونشر اجساد، قیامت ملائکہ، معراج جسمانی عذاب وثواب، برزخ اور جنت ودوزخ وغیرہ کو خلاف عقل کہتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی چیز خلاف عقل نہیں

ہے، اور یہ ساری چیزیں صرف احادیث سے نہیں، بلکہ قرآن کریم سے بھی ثابت ہیں پس اگر انکار حدیث کی یہی بنیاد ہے، تو منکرین حدیث کو سب سے پہلے قرآن کریم سے ہاتھ اٹھانا پڑے گا" اعاذنا اللّٰہ وایّاھُمْ مِنْ ذٰلک۔"

پھر یہ حیلہ اصولی طور پر انکار حدیث کی علت کسی طرح نہیں بن سکتا، بلکہ اگر یہ علت ہر طرح صحیح بھی تسلیم کر لی جائے تو اس کی بنا پر صرف ان احادیث کا انکار صحیح ہو سکتا ہے جن میں خلاف عقل امور مذکور ہیں، پس یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ معدودے چند احادیث کی وجہ سے سارا ذخیرۂ حدیث بے اعتبار و بے کار قرار دے دیا جائے کیا اس کی بعینہٖ وہی مثال نہ ہوگی کہ ایک شخص کے پاؤں میں ناسور ہو جائے اور ڈاکٹر صرف پاؤں کاٹنے کے بجائے اس مریض ہی کا خاتمہ کر دے۔

جی چاہتا تھا کہ اس مسئلہ کو ذرا تفصیل سے لکھوں لیکن افسوس کہ یہ اس تفصیل کا موقع نہیں ہے، آگے ابھی بہت ساری باتیں لکھنی ہیں اس لئے میں اپنے ناظرین سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے معاف فرمائیں۔ اور مزید تفصیل مطلوب ہو تو علامہ یراحمد صاحب عثمانی دیوبندی کا رسالہ العقل والنقل ملاحظہ فرمائیں۔

منکرین حدیث کو جو وسوسے پیش آئے ہیں میں نے ان کو مع جواب کے ذکر کر دیا، ممکن ہے کچھ اور وسوسے بھی ان کے دل میں آتے ہوں لیکن مذکورہ بالا وسوسوں سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ منکرین حدیث کے وسوسے کہاں تک قابل توجہ والتفات ہو سکتے ہیں، اور سمجھ سکتے ہیں کہ کیا کسی عاقل کو ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی نامعقولیت بودا پن اور کمزوری میں شک ہو سکتا ہے؟ اس لئے مزید تطویل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

یہاں تک جو کچھ مذکور ہوا یہ در حقیقت رسالہ مذکورہ کا اصولی رد، یا اس پر اجمالی تبصرہ تھا اب میں چاہتا ہوں کہ رسالہ مذکورہ پر تفصیلی تبصرہ کر کے اس کے تار تار الگ کر دوں۔ "واللّٰہ الموفق۔"

منکرین حدیث کے رسالہ مذکورہ

پر

تفصیلی تبصرہ

رسالہ زیر نظر کی ابتدائی سطروں میں ”حق گو“ صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ:

> ”مخالفین اسلام نے قرآن واسلام پر جو حملے کئے ہیں، ان کی لفظ بہ لفظ تائید کتب حدیث سے ہوتی ہے۔“

پھر انہوں نے مختلف عنوان قائم کر کے گیارہ صفحات میں اس دعویٰ کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، یہ تو ”حق گو“ صاحب کو آگے چل کر معلوم ہو جائے گا کہ ان کا یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے، اور وہ اس کو ثابت کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، سر دست میں ان سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں اگر بفرض محال ان کا دعویٰ صحیح بھی ہو، اور ان کے دلائل بھی سب درست ہوں، تو اس سے زیادہ سے زیادہ صرف یہ لازم آتا ہے کہ جن حدیثوں سے مخالفین کے حملوں کی تائید ہوتی ہے، وہ قابل تسلیم نہیں ہیں، لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ بقیہ حدیثیں بھی لائق اعتبار نہیں ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ بجائے مخصوص احادیث کے منکرین حدیث ساری حدیثوں کا انکار کرتے ہیں۔ آخر یہ کس عقل کا تقاضا ہے کہ پاؤں کے ناسور کی وجہ سے بجائے پاؤں کاٹنے کے خود مریض ہی کو قتل کر دیا جائے۔

پھر یہ عجیب ذہنیت ہے کہ مخالفین کے لغو اور بے ہودہ اعتراضات کی وجہ سے اپنے مسلمات کو خیر باد کہہ دیا جائے، اگر منکرین حدیث کا یہی اصول ہے، تو حدیث

سے پہلے ان کو قرآن کریم سے انکار کرنا پڑے گا، کیا ان کو معلوم نہیں ہے کہ مخالفین اسلام نے براہ راست قرآن کریم پر بھی حملے کئے ہیں، کیا ان کو خبر نہیں ہے کہ دشمنان اسلام نے قرآن کی معجزانہ فصاحت و بلاغت اور قرآنی احکام کے منزل من اللہ ہونے پر بھی نکتہ چینیاں کی ہیں، تو کیا وہ ان نکتہ چینیوں کی وجہ سے قرآن سے روٹھ جائیں گے؟

''حق گو'' صاحب نے گویا اپنے دعویٰ کے ثبوت میں سب سے پہلی بات تو یہ لکھی ہے کہ حدیثوں سے قرآن کا محرف وناقص ہونا ثابت ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہم روافض کو مطعون کیا کرتے ہیں کہ وہ قرآن کو محرف وناقص بتاتے ہیں لہٰذا وہ قطعی کافر ہیں، مگر کیا یہ حدیثیں صحاح ستہ کی نہیں ہیں۔''

اس کے بعد چند حدیثوں کے ترجمے اس غرض کے لئے نقل کئے ہیں کہ ان سے قرآن کا محرف وناقص ہونا ثابت ہے۔

لیکن مجھ کو بے حد افسوس ہے کہ ''حق گو'' صاحب نے یہاں پر انتہائی خیانت اور حد درجہ سفاہت اور بے عقلی کا ثبوت دیا ہے، کسی بات کے سمجھنے سے پہلے بول دینے کا ہمیشہ یہی نتیجہ ہوتا ہے، کہ بولنے والے کی حماقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ''حق گو'' صاحب کو خبر تو ہے نہیں کہ شیعوں کا عقیدہ قرآن کی نسبت کیا ہے، اور جو حدیثیں انہوں نے نقل کی ہیں، ان میں کیا بیان ہے، مگر خواہ مخواہ اس لئے کہ ہم بھی پانچویں سواروں میں لگے ان علمی مسائل کی ٹانگ توڑنے، اس لئے میں پہلے شیعوں کا عقیدہ ''حق گو'' صاحب کو بتاتا ہوں، اس کے بعد ان کی ذکر کی ہوئی حدیثوں کا مفہوم ان کو ذہن نشین کراؤں گا۔

روافض کا عقیدہ تحریف قرآن

''حق گو'' صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ روافض قرآن کریم کی نسبت یہ عقیدہ

رکھتے ہیں کہ:

> "آنحضرت ﷺ پر جو قرآن نازل ہوا تھا، اس کا پورا حافظ بجز حضرت علی کے کوئی نہ تھا، اور اس قرآن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بقیہ گیارہ ائمہ معصومین کی ولایت و امامت کی نام بنام تصریح و تنصیص تھی، اور وہ موجودہ قرآن سے بہت بڑا تھا، اس قرآن میں ستر ہزار آیتیں تھیں مگر جب عہد صدیقی میں قرآن جمع کیا گیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن کے بہت سے الفاظ بدل دیئے، اور بہت سے کلمات نکال ڈالے، امامت ائمہ والی آیتیں بالکل حذف کر ڈالیں، کچھ آیتیں صحابہ رضی اللہ عنہم نے خود بنا کر داخل قرآن کر دیں، اور اس کی ترتیب بھی گڑبڑ کر دی۔"[1]

اور رافضی مصنفین اقرار کرتے ہیں کہ اس مضمون کی متواتر روایتیں ائمہ معصومین رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں، اور اقرار کرتے ہیں کہ ان روایتوں سے قرآن کا محرف ہونا صراحۃً ثابت ہے، اور اقرار کرتے ہیں کہ اسی بنا پر علمائے مذہب شیعہ کا عقیدہ ہے، کہ قرآن محرف ہے۔[2] اتنا معلوم کرنے کے بعد "حق گو" صاحب اپنی پیش کردہ روایات پر ایک بار پھر نظر ڈال کر بتائیں کہ ان روایات سے عقیدہ مذکورہ رافضہ کا کون سا جز ثابت ہوتا ہے؟

"حق گو" کی پیش کردہ روایات کا مفہوم

"حق گو" صاحب کو اگر عقل سے دور کا علاقہ بھی ہوتا، تو وہ سمجھ سکتے کہ ان کی پیش کردہ روایتوں میں سوائے اس کے اور کچھ مذکور نہیں ہے کہ ایک آیت اتری پھر

---

[1] ثبوت کے لئے دیکھو اصول کافی طبع لکھنو ص۲۶۲، ص۲۷۱، ۲۶۷ احتجاج طبرسی مطبوعہ ایران ص۱۱۹ تا ۱۳۲ دیباچہ تفسیر صافی طبع ایران، تفسیر قمی طبع ایران فصل الخطاب ص۹۷

[2] فصل الخطاب طبع ایران

اس کی تلاوت ہوگئی، یا یہ کہ فلاں سورت میں فلاں آیت بھی عہد نبوی میں پڑھی جاتی تھی، یا یہ کہ فلاں آیت کو ایک صحابی یوں پڑھتے تھے، اور دوسرے صحابی دوسری طرح پڑھتے تھے، لیکن ان تینوں باتوں میں سے کسی سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن میں جامعین قرآن رضی اللہ عنہم نے تحریف کردی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس روایت میں کسی آیت کی تلاوت کا موقوف ہوجانا مذکور ہے، اس کا صاف وصریح مفہوم یہ ہے کہ اس آیت کی تلاوت کو خود خدا نے موقوف فرمادیا اور ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ صاحب کتاب کا اپنی کتاب کے کسی حصہ کو اپنی کتاب سے نکال دینا تحریف نہیں ہے، تحریف تو اس کو کہتے ہیں کہ صاحب کتاب کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس کی کتاب میں اس قسم کا تصرف کرے۔

اسی طرح جن روایات میں یہ مذکور ہے کہ فلاں سورۃ میں فلاں آیت بھی عہد نبوی میں پڑھی جاتی تھی، ان میں بھی تحریف قرآن کا کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔

ایک اعتراض کا جواب

اگر آپ کہیں کہ ہاں روایات میں یہ تو نہیں ہے، لیکن جس آیت کا ذکر ان روایات میں ہے وہ قرآن میں نہیں ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ قرآن محرف ہے، تو میں کہوں گا، کہ یہ آپ کی غلط فہمی ہے قرآن میں اس آیت کے نہ ملنے پر بھی قرآن کا محرف ہونا ثابت نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ یہ نہ ثابت کیجئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس آیت کو قرآن سے نکالا، اور اس کو آپ ہماری کسی روایت سے ثابت نہیں کرسکتے اصلیت یہ ہے اور ان روایات کا مفہوم بھی یہی ہے کہ وہ آیت پڑھی جاتی تھی لیکن پھر خدا نے اس کی تلاوت موقوف کردی کسی آیت کی تلاوت کا منسوخ کردینا ایک قسم کا نسخ ہے، اور اس کا ثبوت خود قرآن کریم میں ہے جیسا کہ عنقریب آئے گا۔

اختلاف قرأت کی حیثیت

اور تیسری قسم کی روایات جن میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے اختلاف قرأت کا ذکر ہے، ان کو بھی تحریف کے مسئلہ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے، اختلاف قرأت کی قریب قریب وہی حیثیت ہے جو کتابوں میں نسخوں کے اختلاف کی حیثیت ہوتی ہے تو جس طرح کہ ان مختلف نسخوں میں سے جس نسخے کو پڑھنے والا چاہے اختیار کر سکتا ہے، اور اس پر الزام تحریف عائد نہیں ہو سکتا، اسی طرح قرآن کریم کے بعض، الفاظ و کلمات میں مختلف قرأتیں ہیں اور وہ سب آنحضرت ﷺ کی تعلیم سے ثابت ہیں جس صحابی نے جو لفظ جس طرح آنحضرت ﷺ سے سنا تھا، اگر اس کو اسی طرح پڑھا تو اس کو تحریف کہنا سراسر جہالت ہے۔

تمثیل

کے طور پر سنئے کہ سعدی ؒ کے اس شعر کے پہلے مصرع میں دو نسخے ہیں: ؎

عزیزے کہ ہر کز درش سر بتافت
بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت
عزیزے کہ از در گہش سر بتافت
بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

جس کا مطلب یہ ہے کہ مصنف ؒ کی طرف سے دونوں طرح پڑھنے کی اجازت ہے لہٰذا ان میں سے جو نسخہ کسی نے پڑھا خطا وار نہ ہوگا نہ اس پر تحریف کا الزام عائد ہوگا بس اسی پر اختلاف قرأت کے مسئلہ کو قیاس کر لیجئے۔

نسخ کی تعریف اور اس کا ثبوت

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ”حق گو“ صاحب نسخ کے منکر ہیں اور ان کو نسخ و تحریف کا

فرق بھی معلوم نہیں ہے، اسی وجہ سے ان کو اپنی پیش کردہ روایات کے صحیح مفہوم تک رسائی نہ ہو سکی، اور اپنی ناواقفیت کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ روایات تحریف قرآن پر دلالت کرتی ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ ان کے سامنے نسخ کی تعریف اور اس کا ثبوت پیش کیا جائے۔

نسخ کی تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی آیت کی صرف تلاوت یا اس کے حکم یا دونوں کو اس لئے موقوف کردے، کہ اس کی مدت ختم ہوگئی، اور چونکہ اس کا نفاذ اتنے ہی زمانہ کے لئے ہوا تھا، اور جو غرض اس کے نفاذ سے وابستہ تھی، وہ حاصل ہوگئی لہذا اب آئندہ اس کو موقوف کیا جاتا ہے۔

ہر ملت و مذہب میں ناسخ و منسوخ کی مثالیں موجود ہیں، اور اس کا راز یہ ہے کہ اصلاح چاہے جسمانی ہو یا روحانی اصول کے ساتھ اور بتدریج ہو تو بہت مفید و نافع ہوتی ہے، اور اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے، اور اس طرح مرض کا دفعیہ بھی بالکلیہ ہوتا ہے اور مریض کو زیادہ مشقت و دشواری بھی پیش نہیں آتی اور اس اصولی و تدریجی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ پہلے مریض کو کوئی آسان طریق اصلاح بتا کر اس کا پابند بنایا جائے جب کچھ دن گزر جائیں، اور طبیعت میں دوسرے علاج کے لئے مناسب استعداد پیدا ہو جائے، تو پہلے علاج کو موقوف کر کے دوسرے کی ہدایت کی جائے، اور یونہی رفتہ رفتہ مرض کے جملہ اسباب کو فنا کرنے اور طبیعت کو اس کے اصلی اعتدال پر لانے کی تدبیر کی جائے۔

فرض کیجئے ایک شخص کا خون فاسد ہو گیا ہے، اور وہ اس کی وجہ سے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہے جب یہ آدمی طبیب کے پاس جائے گا تو طبیب پہلے منضج کا نسخہ لکھے گا، اور ایسی دوائیں دے گا، کہ مادہ میں پختگی آجائے، کچھ دنوں کے استعمال سے جب یہ غرض حاصل ہو جائے گی، تو طبیب نسخہ بدل دے گا، اور بجائے اس کے دست آور دوائیں دے کر مواد فاسد کا اخراج کرے گا، لیکن چونکہ مواد فاسد کے ساتھ

ساتھ کچھ صالح اجزاء بھی خارج ہو جاتے ہیں، اور مریض کو نقاہت ہو جاتی ہے، اس لئے پھر تیسرا نسخہ لکھے گا، تاکہ اس نقصان کی تلافی ہو اور نقاہت رفع ہو جائے۔

اسی مثال پر روحانی اصلاح کو بھی قیاس فرمائیے، کہ جب کسی قوم میں اخلاقی امراض پیدا ہو جاتے ہیں، اور ان کی روحانی حالت بہت بدتر ہو جاتی ہے، تو اللہ رب العزت اپنی غایت رافت و وفور رحمت سے اس کی اصلاح کے لئے کسی طبیب روحانی (رسول) کو مبعوث فرماتا ہے، اور چونکہ خدا اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے، اس لئے یک بارگی ان پر سخت سخت پابندیاں عائد نہیں کرتا، بلکہ بتدریج ان کی اصلاح کی تدبیر کرتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے ایک حکم دے کر اس کی پابندی کراتا ہے، پھر جب دوسرے حکم کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، تو پہلا حکم اٹھا کر دوسرے کی پابندی لازم کرتا ہے اسی کو اصطلاح شریعت میں نسخ کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک صورت اور بھی ہوتی ہے، آپ نے جسمانی اصلاح کے سلسلہ میں بار بار مشاہدہ کیا ہوگا کہ اطبائے جسمانی ایک ہی مرض کا مختلف علاج کرتے ہیں جس کی وجہ بعض دفعہ یہ ہوتی ہے کہ اس مرض کے اسباب مختلف ہوتے ہیں، لہذا پہلے طبیب یہ دیکھتا ہے کہ یہ مرض کیوں پیدا ہوا، پس جو سبب اس کو معلوم ہوتا ہے، اسی کے دفعیہ کی کوشش کرتا ہے، مثلاً بخار ایک مرض ہے لیکن اس کے اسباب مختلف ہیں کسی کو بخار آتا ہے، اور اس کا سبب فساد بلغم ہوتا ہے، اور کسی کو فساد صفراء کی وجہ سے بخار آتا ہے، پس باوجودیکہ مرض ایک ہی ہے لیکن علاج مختلف ہوگا، ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ تدابیر اختیار کرے گا۔

اور بعض دفعہ اختلاف علاج کی وجہ زمانہ یا مقام یا مزاج کا اختلاف ہوتا ہے ایسا بہت ہوتا ہے، کہ ایک خاص طریق علاج ایک خاص مرض کے لئے موسم گرما میں مفید واقع ہوتا ہے لیکن وہی علاج اسی مرض کے لئے سردیوں میں مفید نہیں ہوتا، ایک علاج گرم ممالک میں کسی خاص مرض کے لئے تیر بہدف ثابت ہوتا ہے، لیکن سرد

ملکوں میں اس سے کوئی نفع نہیں ہوتا، یا گرم مزاج والے کے لئے نافع ہوتا ہے اور سرد مزاج والے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

بالکل یہی حال روحانی علاج کا بھی ہے، کہ ایک قوم کے لئے جو اصلاحی تدبیر اختیار کی جاتی ہے، وہ تدبیر بعض اوقات میں دوسری قوم کے لئے زمانہ کے بدل جانے سے یا اختلاف مزاج یا تفاوت اسباب کی وجہ سے مفید نہیں ہوتی، اس لئے اللہ رب العزت قوموں کی اصلاح کے لئے جو شریعتیں نازل کرتے ہیں، بسا اوقات ان کے احکام میں ترمیم و تنسیخ بھی فرماتے ہیں، نسخ کی ایک صورت یہ بھی ہے، میرے اس بیان سے نسخ کی حقیقت آپ نے سمجھ لی ہوگی اور آپ کو یقین ہو گیا ہوگا کہ ہر اصلاحی تحریک اور ہر حکیمانہ طریق علاج کے لئے نسخ ضروری چیز ہے، اور شرائع الہیہ میں ناسخ و منسوخ کا وجود عیب و نقص نہیں، بلکہ ان کا حسن و کمال ہے لیکن جن لوگوں نے نسخ کی حقیقت کما حقہ نہیں سمجھی ہے ان کو مختلف قسم کے وسوسے پیدا ہوتے ہیں، ایک جماعت نے یہ خیال کیا کہ نسخ سے باری تعالیٰ کا جہل لازم آتا ہے، اس جماعت کو نسخ پر بدا کا دھوکا ہو گیا، اور ان دونوں کو اس نے ایک سمجھ کر یہ خیال قائم کر لیا، حالانکہ دونوں میں بڑا عظیم الشان فرق ہے، بدا کی حقیقت یہ ہے کہ ایک حکم دینے کے بعد حکم دینے والے کا علم بدل جائے، اس کی رائے میں انقلاب پیدا ہو جائے، اور اس حکم کو واپس لے لے اور اس کی جگہ دوسرا حکم نافذ کرے، برخلاف نسخ کے کہ اس میں علم نہیں بدلتا بلکہ اس میں پہلے ہی سے یہ علم رہتا ہے، کہ حکم اول ایک خاص مدت تک کے لئے ہے اس کے بعد دوسرا فلاں حکم نافذ کیا جائے گا، اور پہلے کو موقوف کر دیا جائے گا کیا طبیب کو منضج کا نسخہ لکھنے کے وقت یہ علم نہیں ہوتا کہ اس نسخہ پر پانچ سات دن سے زیادہ عمل نہ کرایا جائے گا، اور کیا جب مسہل تجویز کرتا ہے، تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں نے منضج دینے میں غلطی کی تھی اور اب اس غلطی پر متنبہ ہو کر دوسری رائے قائم کرتا ہوں، ہرگز نہیں، اسی مثال پر نسخ کے احکام کو بھی

قیاس کیجئے، تو آپ پر ظاہر ہو جائے گا کہ، نسخ دلیل جہل نہیں، بلکہ نہایت زبردست حکمت اور ایک عظیم الشان علم کی روشن دلیل ہے۔

بعض مشرکین اور یہود کو اسی قسم کے شبہات پیش آئے، اور اسی بنیاد پر انہوں نے قرآن و مبلغ قرآن کے حق میں زبان طعن دراز کی، تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

﴿وَ اِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾[1]

تَرْجَمَہ: ”جب ہم کسی آیت کے عوض میں دوسری آیت نازل کرتے ہیں اور اس کی حکمت و مصلحت کو خوب جانتے ہیں تو مخالفین کہتے ہیں کہ (اے رسول) تم تو بس افتراء پرداز ہو (خدا کہتا ہے کہ ہمارا رسول افتراء پرداز نہیں ہے) بلکہ مخالفین میں سے اکثر و بیشتر اشخاص جاہل اور ہماری مصلحتوں سے ناواقف ہمارے کاموں کی حکمتوں سے بے علم ہیں۔“

اس آیت سے نسخ کی حکمت کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو وحی نبی عربی روحی لہ الفداء پر نازل کی ہے، اس میں بھی بعض چیزوں کو ایک خاص وقت تک کے لئے نازل کیا، اور پھر اس کو منسوخ فرما دیا، جس پر مشرکین معترض ہوئے اسی مضمون کو ایک دوسری آیت میں بھی بیان کیا ہے۔

﴿مَا ننسخ من آیة او ننسها نات بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مثلها اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰه علی کل شیءٍ قَدِيْرٌ﴾[2]

تَرْجَمَہ: ”یعنی جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو (لوگوں کے دلوں سے) فراموش اور محو کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کے مثل

---

[1] سورہ نحل پ ۱۴ [2] بقرہ

(دوسری) لاتے ہیں کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

اس آیت میں بھی وہی حکمت سمجھائی گئی ہے، کہ جب کوئی آیت منسوخ کی جاتی ہے تو اس کے بدلے اس سے اچھی یا ویسی ہی دوسری چیز لائی جاتی ہے، مگر چونکہ پہلی چیز کا اب وقت نہیں رہا، اس لئے وہ منسوخ کر دی جاتی ہے۔

یہ دونوں آیتیں نسخ کے اثبات میں ایسی صریح ہیں کہ ان کے بعد کوئی ادنیٰ درجہ کا مومن بھی نسخ کا انکار نہیں کر سکتا، جب یہ ثابت ہو چکا تو اب سنئے کہ نسخ کی مختلف صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ کوئی آیت قرآن میں نازل کی گئی، اور کچھ دنوں تک اس کی تلاوت جاری رکھی، پھر کسی خاص مصلحت سے اللہ تعالیٰ نے اس کی تلاوت موقوف کر دی، مثلاً جب اصحاب بیر معونہ نہایت بیدردی سے شہید کئے گئے، اور تمام مسلمانوں کو عموماً اور ان کے اعزہ کو خصوصاً نہایت صدمہ پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی دلدہی و تسلی اور شہداء کی مقبولیت اور ان کی عزت و حرمت کے اظہار کے لئے ایک آیت نازل فرمائی، جب کچھ دنوں تک اس کی تلاوت ہو چکی اور مسلمانوں کے زخم مندمل ہو چکے، اور شہداء کی عزت و حرمت دلوں میں راسخ ہو چکی، تو اس آیت کی تلاوت موقوف کر دی گئی، اسی کا نام اصطلاح میں نسخ تلاوت ہے۔

تحریف و نسخ کا فرق

بہت سے کم علم یا ابلہ فریب لوگ تحریف و نسخ میں فرق نہیں کر سکے اور نسخ تلاوت کی روایات کو تحریف کے ثبوت میں حماقت یا بے حیائی سے پیش کر دیتے ہیں، حالانکہ دونوں میں کوئی نسبت نہیں ہے، اوپر کے بیان سے آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا، کہ نسخ اس تصرف و تبدل کا نام ہے، جو کتاب کے نازل کرنے والے خود اللہ جل مجدہ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے، اور تحریف کا یہ مطلب ہوتا ہے، کہ خدا کے علاوہ کوئی دوسرا خدا کے حکم و مرضی کے خلاف اس کی کتاب میں کوئی تصرف بے جا

کرے، دیکھئے مصنفین اپنی تصنیفات میں رات دن محو واثبات ترمیم و تنسیخ اور اصلاح واضافہ کرتے رہتے ہیں، اور دنیا میں کوئی دشمن خرد ایسا نہیں ہوا، جو اس کو تحریف کہتا ہو لیکن ایک دوسرا شخص اس کتاب کا ایک لفظ بھی بدل دے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے کتاب میں تحریف کردی جب یہ فرق ذہن نشین ہو گیا، تو اب سنئے کہ روافض کا عقیدہ ہے کہ کتاب اللہ میں کچھ انسانوں نے بہت سے بے جا تصرفات کئے ہیں، لہذا روافض تحریف قرآن کے قائل ہوئے، اور آپ نے ہماری جو روایتیں پیش کی ہیں ان میں انسانوں کے تصرف کا کوئی ذکر نہیں بلکہ خدا کے تصرف کا ذکر ہے لہذا ہم اہلسنت کو قائل تحریف کہنا جہالت اور افتراء ہے۔

انبیاء کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا

"حق گو" صاحب نے دوسری بات یہ لکھی ہے:

> "ہم روافض کو طعنہ دیا کرتے ہیں کہ انہوں نے نبوت اور خلافت راشدہ کو ذاتیات ونفسیات سے ملوث کیا مگر کس منہ سے؟ کیا یہ حدیث حضرت عائشہ کی مسلم میں موجود نہیں ہے۔"

اس کے بعد اس حدیث کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے جس میں حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آدمی بھیج کر ترکہ رسول اللہ ﷺ سے اپنا حصہ مانگنا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ جواب دینا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہمارے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ اور یہ کہنا کہ حضور ﷺ اپنی زندگی میں اپنے صدقے کو جس طرح تقسیم کرتے تھے، اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں کرسکتا، اس پر فاطمہ رضی اللہ عنہا کا خفا ہو جانا اور ملاقات چھوڑ دینا، اور جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خبر نہ کرنا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تنہا ان کی نماز جنازہ پڑھ کر رات ہی کو دفن کر دینا مذکور ہے۔

میں حیران ہوں کہ ”حق گو“ صاحب کو عقل سے اتنی دشمنی کیوں ہے؟ ہم نے تو اس حدیث کے ایک ایک فقرہ کو بار بار پڑھا، لیکن ہم کو ”حق گو“ صاحب کے دعویٰ سے متعلق کوئی بات بھی نہیں ملی، صحیح مسلم کے علاوہ یہ حدیث صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں بھی ہے، اور ان کے اردو تراجم بکثرت دستیاب ہو سکتے ہیں، ہم اردو خواں طبقہ سے اپیل کرتے ہیں، کہ وہ لوگ پوری حدیث پڑھ کر انصاف سے کہیں کہ جب شیعوں اور سنیوں کی متفق علیہ حدیث[1] میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے، کہ انبیاء علیہم السلام کے مال میں وراثت جاری نہیں ہوتی، رسولوں کا متروکہ صدقہ ہوتا ہے، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا متروکہ رسول اللہ ﷺ کو تقسیم نہ کرنا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حصہ نہ دینا نفسانیت ہے یا عین للّٰہیت اور اتباع رسول؟

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے سیدۃ النساء کا ناراض ہونا

اور اس پر اگر حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا خفا ہو گئیں تو یہ ان کی لغزش تھی، یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی؟ اسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو اطلاع نہ دی تو اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کون سا قصور ہے؟ ہاں اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اطلاع کی ہوتی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بلا عذر شرعی شریک جنازہ نہ ہوتے، تو بے شک ان کا قصور تھا، مگر یہاں تو صاف تصریح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خبر نہیں بھیجی بہر حال روایت سے خلیفہ راشد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نفسانیت کسی طرح ثابت نہیں ہوتی، ہاں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک طرح کی کمزوری ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن یہ حضرات انسان تھے، اور انسانی کمزوریوں سے پاک نہ تھے خطا و لغزش سے منزہ و معصوم نہ

---

[1] شیعوں کی سب سے مستند کتاب کافی کا مطالعہ کرو

تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جواب بالکل حق وصواب تھا، لیکن ان حضرات نے کامل تدبر وغور نہ فرمایا، اس لئے رنجیدہ خاطر ہوگئے، لیکن بعد میں جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حق بجانب ہونا ظاہر ہوگیا تو یہ رنجش جاتی رہی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حق بجانب ہونے کی بڑی زبردست دلیل یہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ مسند آرائے خلافت ہوئے، تو انہوں نے بھی فدک وغیرہ کو یعنی ان جائدادوں کو جن میں اپنے حصہ کی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا دعویدار تھیں، تقسیم نہ کیا، اور ان میں انہی احکام کو جاری رکھا، جو عہد رسول اللہ ﷺ سے لے کر عہد عثمان رضی اللہ عنہ تک جاری تھے، اور رنجش کے رفع ہونے کا ثبوت خود اسی حدیث میں موجود ہے۔ اور بصراحت مذکور ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر میں بلایا، اور بڑی معذرت کی، فرمایا کہ ہم کو تو کبھی یہ وہم بھی نہ ہوا تھا کہ خلافت کا حقدار آپ سے زیادہ کوئی ہوسکتا ہے لیکن ہاں رنج صرف اتنی بات کا تھا، کہ جب آپ سے لوگوں نے بیعت کی تو اس وقت ہم لوگ موجود نہ تھے، کسی نے ہم کو بلا کر ہماری رائے بھی نہ پوچھی، خیر وہ بات تو گزر گئی اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ شام کو مسجد میں علی الاعلان آپ کے ہاتھ پر بیعت کروں گا، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس وعدہ کا ایفاء کیا، اس ملاقات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا خاندان مجھے اپنے خاندان سے زیادہ عزیز ہے، میں جو سلوک واحسان اپنے خاندان کے لئے ضروری سمجھتا ہوں اس کو پہلے خاندان رسول ﷺ کے ساتھ کروں گا، اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جائداد رسول ﷺ کا قضیہ بالکل نہ چھیڑا۔

حضور ﷺ کے بعد کون لوگ مرتد ہوئے

"حق گو" صاحب نے تیسری بات یہ کہی ہے:

"روافض کے اس وہم کی یقیناً ہم شدت سے تردید کریں گے کہ

> آنحضرت ﷺ کے بعد بجز معدودے چند صحابہ کے سب مرتد ہوگئے سبحان اللہ ہذا بہتان عظیم مگر اس کو کیا کیا جائے کہ خود مسلم کی حدیث اس کی تائید میں یہ روایت پیش کر رہی ہے۔"

اس کے بعد "حق گو" صاحب نے حدیث حوض پیش کی ہے، لیکن اس حدیث کو ان کے مدعا سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے کہ حدیث حوض میں زیادہ سے زیادہ یہ مذکور ہے کہ کچھ لوگ میری امت کے لائے جائیں گے، اور ان کو بائیں طرف (یعنی دوزخ کی طرف) لے جایا جائے گا، آنحضرت ﷺ فرمائیں گے کہ یارب یہ تو میرے لوگ ہیں، جواب میں کہا جائے گا کہ آپ نہیں جانتے، انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا آپ جب سے ان سے جدا ہوئے، یہ لوگ ہمیشہ پھرتے ہی رہے۔

اس میں اولاً تو صحابہ ؓ کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ عام امت کے کچھ لوگوں کا ذکر ہے ثانیاً اگر بفرض محال صحابہ ؓ ہی مراد ہوں، تو کچھ صحابہ مراد ہوں گے اور رافضیوں کا دعویٰ ہے کہ بجز معدودے چند کے سب صحابہ ؓ مرتد ہوگئے تھے (معاذ اللہ) پھر معلوم نہیں "حق گو" صاحب نے کس طرح یہ کہہ دیا کہ اس حدیث سے رافضیوں کے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے، حق گو صاحب کو رافضیوں کی دوستی اور حدیث کی دشمنی میں یہ بھی نظر نہ آیا کہ حدیث میں تو خود یہ بیان موجود ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کون لوگ مرتد ہوئے تھے، اور حدیث زیر بحث کے مصداق کون لوگ ہیں؟

صحیح مسلم (جلد ۱ صفحہ ۳۷) مطبوعہ مجتبائی دہلی میں مذکور ہے کہ:

> "جب آنحضرت ﷺ نے وفات پائی، اور حضرت ابوبکر ؓ خلیفہ ہوئے تو عرب کے کچھ لوگ (جو عہد نبوی ﷺ میں) مسلمان ہوئے تھے مرتد ہوگئے حضرت ابوبکر ؓ نے ان سے قتال کیا۔"

اس کے علاوہ تاریخ کی تمام مستند کتابوں میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ کی

وفات کے بعد جو لوگ مرتد ہوئے تھے وہ بنو حنیفہ وغیرہ کے کچھ لوگ تھے، ان میں کوئی مشہور صحابی نہ تھا[۱] ثبوت کے لئے دیکھو۔[۲]

حدیث وتاریخ کی ان تصریحات سے آنکھیں بند کر کے یہ لکھ دینا کہ حدیث زیرِ بحث سے رافضیوں کی تائید ہوتی ہے عقل کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں تو اور کیا ہے؟

اس کے بعد ”حق گو“ صاحب نے مختلف عنوانوں کے تحت وہ روایتیں پیش کی ہیں جن کا تعلق ان کے زعمِ فاسد میں براہِ راست مقامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، پہلا عنوان یہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں کی خرافات کو سن کر وحیِ الٰہی کی طرح پیش کرتے تھے

اس عنوان کے ماتحت ”حق گو“ نے دو حدیثیں نقل کی ہیں، پہلی حدیث کا مضمون یہ ہے کہ:

> ”ایک یہودی عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تم قبر میں آزمائے جاؤ گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ یہود کے واسطے ہوگا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر چند ہی راتیں گزری تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عذابِ قبر سے پناہ مانگتے تھے۔“

”حق گو“ صاحب اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

❶ مشرکین ونصاریٰ کا یہ اعتراض ہے کہ نبی عربی لوگوں کی باتیں سن

---

[۱] اور بعض غیر مشہور اشخاص جو صرف ایک بار خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تھے وہ چند دنوں کے بعد ارتداد سے تائب ہو کر مدۃ العمر اسلام کے حلقہ بگوش رہے

[۲] کامل ابن اثیر: ۲/۱۳۰، مسعودی: ۲/۱۰۳، تاریخ الخلفاء ص ۵۱

سن کر وحی الٰہی بنا کر پیش کرتے تھے، حدیث سے اعتراض کی تائید ہوتی ہے۔

② حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جس آیت کا حوالہ دیا ہے، وہ قرآن میں کہیں نہیں ہے۔

③ قرآن میں عذاب قبر کے خلاف متعدد آیتیں موجود ہیں۔

④ خود یہود کا عقیدہ بھی یہ نہیں ہے۔

جواب: حق گو صاحب کی پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث سے اعتراض مذکور کی تائید تو کسی طرح نہیں ہوتی، ہاں اس اعتراض کی تردید ضرور ہوتی ہے اور وہ اس طرح پر کہ اگر مشرکین و نصاریٰ کا یہ اعتراض صحیح ہوتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہودی عورت کا مقولہ سن کر گھبراتے نہیں، اور نہ چند راتوں کے گزرنے کا انتظار کرتے بلکہ سنتے ہی فوراً فرماتے کہ یہ عورت ٹھیک کہتی ہے، یہودیہ کی یہ بات سن کر گھبرا جانا اور چند راتیں گزرنے پر اس کی تصدیق کرنا ہی تو اس بات کی دلیل ہے، کہ جب تک براہ راست آپ پر منجانب اللہ وحی نہیں آتی تھی، اس وقت تک آپ کسی کی موافقت نہیں فرماتے تھے اور نہ کوئی بات کہتے تھے۔

عیسائی اور یہودی مذہب کی بکثرت تردید
قرآن وحدیث میں

اس کے علاوہ مشرکین و نصاریٰ کے الزام کی لغویت یوں بھی ظاہر ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کی سنی ہوئی باتوں ہی کو وحی بنا کر پیش کرتے، تو قرآن اور احادیث میں یہود و نصاریٰ یا مشرکین کے مسلک کے خلاف کوئی بات نہ ہوتی، لیکن قرآن وحدیث پر ایک سرسری نظر ہی ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان فرقوں کے مسلک کے خلاف بے شمار باتیں شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا التحیۃ میں موجود ہیں کیا خود

قرآن میں بتصریح مذکور نہیں ہے کہ اونٹ کا گوشت بنی اسرائیل کے لئے حرام تھا، مگر شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں حلال ہے، کیا قرآن میں مصرح نہیں ہے، کہ مشرکین عرب بحیرۃ وسائبہ وغیرہ کو حرام سمجھتے تھے، مگر شریعت محمدیہ (صلی اللہ علی صاحبہا) نے اس کی مخالفت کی، کیا قرآن میں مصرح نہیں ہے کہ عیسائیوں نے حضرت مسیح کو ابن اللہ اور بعضوں نے الٰہ قرار دیا، لیکن نبی آخر الزماں ﷺ نے اس عقیدہ کی مخالفت اور سخت تردید کی، اور جس طرح یہ باتیں قرآن کریم سے ظاہر ہوتی ہیں اس سے بہت صاف حدیثوں میں مذکور ہیں۔

ایک اعتراض کا جواب

اگر ”حق گو“ صاحب کہیں کہ چونکہ حدیث زیر بحث میں رسول اللہ ﷺ کا یہودیہ کی تصدیق کرنا مذکور ہے اور اسی تصدیق وموافقت سے مخالفین کے الزام کی تصدیق ہوتی ہے، تو میں عرض کروں گا، کہ اگر ایک یا چند باتوں میں موافقت پائے جانے ہی پر الزام کی بنیاد ہے، تو دنیا میں کوئی مذہب بھی اس الزام سے بری نہیں ہو سکتا، دنیا میں کوئی دائی مذہب ایسا نہیں گزرا ہے، جس کی کوئی نہ کوئی بات کسی سابق دائی مذہب کی بات کے موافق نہ ہو بالخصوص حضرت مسیح علیہ السلام کی تو اکثر تعلیمات اگلے دائی مذہب کی تعلیمات کے حرف بحرف مطابق ہیں۔

قرآن پہلی آسمانی کتابوں کا مصدق ہے

اس کو بھی جانے دیجئے اور مجھے یہ بتائیے کہ اگر آپ کے ترک وانکار حدیث کی یہی بنیاد ہے، تو آپ قرآن کریم پر کیسے ایمان لا سکتے ہیں، آخر قرآن بھی تو خود کو اگلی کتابوں کا مصدق بتاتا ہے، تو کیا قرآن کی تصدیق وموافقت سے مخالفین کا الزام قوی نہ ہوگا، اگر نہیں تو کیوں؟ اور اگر ہوگا تو آپ کا نزلہ حدیثوں ہی پر کیوں گرتا ہے۔

پھر اگر آپ کو مخالفین کے الزام ہی کا دفعیہ منظور تھا، تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ آپ مطلقاً ساری حدیثوں کا انکار کر کے بخیال خویش اس جوابدہی سے سبکدوش ہو جاتے، بلکہ صرف یہ فرما دیتے جب بھی سبکدوشی حاصل ہو جاتی کہ حدیث زیر بحث میں یہ واقعہ جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وہ صحت سے عاری ہیں، کسی راوی سے بھول ہوگئی ہے، اس لئے اس نے اصل واقعہ کی صورت بدل دی، اصل واقعہ یوں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو عذاب قبر کا علم نہ تھا جب یہودی عورت سے اس کا ذکر سنا تو ان کو تعجب ہوا لیکن آنحضرت ﷺ سے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ عذاب قبر حق ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس سوال سے آنحضرت ﷺ نے محسوس کیا کہ اس مسئلہ سے ابھی لوگ واقف نہیں ہوئے ہیں اس لئے آپ نے نمازوں میں عذاب قبر سے پناہ مانگنا شروع کیا، تاکہ اس مسئلہ سے سب لوگ آگاہ ہو جائیں۔

معترض کی ناسمجھی

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حدیث مذکور میں کسی آیت کا حوالہ نہیں دیا ہے، شاید ''حق گو'' صاحب کو وحی کے لفظ سے دھوکا ہوا، اگر ایسا ہے تو یہ ان کی ناواقفیت ہے، بات یہ ہے کہ حق گو صاحب وحی کو قرآن میں منحصر سمجھتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

وحی غیر متلو کی حقیقت

قرآن کے علاوہ بھی ایک وحی ہے جس کو وحی غیر متلو کہتے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ پر جو وحی آتی تھی، اس کی دو قسمیں تھیں ایک وہ جس کے معنی کے ساتھ الفاظ بھی منجانب اللہ نازل ہوتے تھے اس کو حضور بعینہٖ انہی الفاظ میں لوگوں کو سناتے تھے اسی کو قرآن اور کتاب اللہ کہتے ہیں دوسری وہ جس کے صرف معنی نبی ﷺ کے قلب میں القاء ہوتے تھے اور اس کو اپنے الفاظ میں حضور ﷺ

بیان کرتے تھے، اسی کو وحی غیر متلو کہتے ہیں۔

اس کا ثبوت قرآن مجید سے

اس کا ثبوت خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ ارشاد ہے۔

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ﴾

ترجمہ: ''(یعنی) ہم نے آپ پر کتاب نازل کی تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز کے ذریعہ فیصلہ کریں جو اللہ آپ کو سوجھائے اور سمجھائے۔''

اس آیت میں دو چیزوں کا ذکر ہے ایک ''کتاب'' وہ تو وحی متلو ہے، دوسری وہ بات جو خدا تعالیٰ اپنے نبی کو سوجھائے اور سمجھائے، یعنی آپ کے قلب میں جو علوم و حکم و اسرار القاء فرمائے، یہ وحی غیر متلو ہے۔

''حق گو'' کی عقلمندی کا نمونہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث زیر بحث میں جس وحی کا ذکر ہے وہ بھی وحی غیر متلو ہے، لہٰذا اس کو قرآن میں تلاش کرنا ''حق گو'' صاحب کی عقل مندی ہے ''حق گو'' صاحب کا اس ناواقفیت پر ہم کو بڑا افسوس ہے، اگر انہوں نے سرسری نظر سے بھی قرآن پڑھا ہوتا، تو ان کو معلوم ہوتا کہ دل میں کوئی بات ڈال دینے کے لئے لفظ وحی کا اطلاق بکثرت قرآن مجید میں ہوا ہے ① (مثلاً) ''واوحی ربك الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا'' یعنی ہم نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈالی کہ بنا تو پہاڑوں میں گھر ② ''واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیه'' یعنی ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں ڈالا کہ تو اس کو دودھ پلا ③ ''یوحی بعضهم الی بعض زخرف القول غرورا.'' یعنی ان کا بعض بعض کے دل

میں ڈالتا ہے مطمع بات فریب کاری کی رو سے کیا "حق گو" صاحب ان آیتوں میں وحی کا لفظ دیکھ کر اس جستجو میں معروف ہو جائیں گے کہ شہد کی مکھیوں پر کون سا قرآن نازل ہوا تھا اور مادر موسیٰ علیہ السلام پر کونسی کتاب الٰہی نازل ہوئی تھی۔

عذاب قبر کا ثبوت قرآن مجید سے

تیسری بات کا جواب یہ ہے کہ یہ آپ کی صریح غلط بیانی ہے، قرآن مجید میں عذاب قبر کے خلاف ایک لفظ بھی کہیں نہیں، بلکہ اس کے برخلاف قرآن مجید کی متعدد آیات عذاب قبر کی مثبت ہیں مثلاً

① "وحاق بآل فرعون سوء الْعَذاب النَّار يَعْرِضُون عَلَيها غدُوًّا وعشيًّا ويوم تقوم السَّاعة ادخلوا آل فرعون اشد العذاب" یعنی آل فرعون پر بڑا عذاب نازل ہو گیا، وہ آگ جس پر وہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں، اور جس دن قیامت برپا ہوگی تو حکم ہوگا کہ آل فرعون کو سخت عذاب میں ڈالو، اس آیت میں آل فرعون کی ہلاکت کے بعد اور قیامت سے پہلے ان کے عذاب دیئے جانے کا صراحۃً ذکر موجود ہے، اور عذاب قبر کا یہی مطلب ہے کہ موت کے بعد اور قیامت سے پہلے جس کو برزخ کہتے ہیں مردوں پر عذاب ہوتا ہے۔

② "ولو ترى اذ يتوفى الذين كفروا الملئكة يضربون وجوههم وادبارهم وذوقوا عذاب الحريق" (یعنی) کاش تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی جان نکالتے ہیں درآنحالیکہ ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے ہیں اور کہتے ہیں چکھو جلنے کا مزا، اس آیت سے بلا کسی تاویل کے واضح ہے کہ موت ہی کے وقت سے کافروں کا عذاب شروع ہو جاتا ہے۔

③ "مِمَّا خَطِيٓـٰٔتِهِم اغرقوا فادخلوا نارًا" یعنی قوم نوح اپنے گناہوں کے سبب ڈبو دی گئی پس آگ میں ڈالی گئی، یہ آیت بآواز بلند پکار رہی ہے کہ نوح علیہ السلام

کی قوم غرق آب ہوتے ہی مبتلائے عذاب ہوگئی، حالانکہ قیامت ابھی تک نہیں آئی ہے، یہ عذاب قبر یعنی عذاب برزخ نہیں تو کیا ہے۔

عذاب قبر کے خلاف قرآن میں ایک لفظ بھی نہیں

یہ تین آیتیں نمونہ کے طور پر پیش کی گئی ہیں، اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں، اور ہمارا دعویٰ ہے کہ قرآن میں اس کے خلاف ایک حرف بھی نہیں ہے "حق گو" صاحب یا ان کے اعوان وانصار میں جرأت ہو تو ایک ہی آیت پیش کر کے اپنی صداقت کا ثبوت دیں۔

"حق گو" کا بے ثبوت دعویٰ

چوتھی بات کا جواب یہ ہے کہ "حق گو" صاحب کا یہ دعویٰ کسی طرح قابل سماعت ولائق اعتبار نہیں ہے، جب کہ انہوں نے اپنے اس دعویٰ پر کہ "یہودی منکر عذاب برزخ ہیں" کوئی شہادت علمائے یہود کی پیش نہیں کی اگر "حق گو" صاحب میں کچھ بھی صداقت ہو تو، عہد نبوی ﷺ کے علمائے یہود یا توریت کی شہادت سے عذاب برزخ کی نفی ثابت کریں۔

"حق گو" کی نقل کردہ دوسری حدیث

"حق گو" صاحب نے عنوان بالا کے ثبوت میں دوسری حدیث یہ ذکر کی ہے:

> "مروان نے اپنے دربان رافع سے کہا کہ ابن عباس کے پاس جاؤ اور کہو کہ اگر ہم میں سے ہر اس آدمی کو عذاب ہو جو اپنے کئے پر خوش ہوتا ہے، اور چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں، اس بات پر جو اس نے نہیں کی، تو ہم سب کو عذاب ہوگا ابن عباس نے کہا تم کو اس آیت سے کیا تعلق، پھر ابن عباس نے یہ آیت پڑھی "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ

الَّذِیْنَ اُوْتُوا الکتابَ لَتُبیِّننه للنَّاسِ ولا تکتمونه" پھر اس آیت کو پڑھا "لا تحسبن الذین یفرحون بما اتوا" ابن عباس نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل کتاب سے کوئی بات پوچھی انہوں نے اس کو چھپایا، اور اس کے بدلے انہوں نے دوسری بات بتائی اس حال میں کہ آپ کو یہ سمجھا دیا کہ ہم نے آپ کو وہ بات جو آپ نے پوچھی تھی بتادی، اور اپنی تعریف کے خواست گار ہوئے، اور اپنے کیے پر خوش ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کو فرمایا ہے، کہ عذاب دے گا، اور (آیت میں وہی) اہل کتاب مراد ہیں۔"

"حق گو" کے مدعائے باطل سے حدیث مذکور کی بے تعلقی

یہ حدیث "حق گو" صاحب کے مدعا سے اور بھی زیادہ بے تعلق ہے ہم کو تو سخت حیرت ہے کہ "حق گو" صاحب نے عنوان مذکور کے ثبوت میں اس حدیث کو پیش کر کے عقلاء کی مجلس میں اپنا مضحکہ کیوں کرایا، کیا کسی غیر مذہب والے سے علمی مذاکرہ کرنا، کسی مسئلہ میں ان کا عقیدہ یا مسلک دریافت کرنا صرف اس لئے ہوتا ہے کہ اس کو معلوم کر کے بطور سرقہ وانتحال کے اپنا مذہب وعقیدہ بنالیا جائے یا معاذ اللہ اس کو وحی الٰہی بنا کر پیش کر دیا جائے پھر حدیث میں تو یہ بھی مذکور نہیں ہے کہ آپ نے یہود سے کوئی مسئلہ پوچھا تھا پھر آپ نے یہ کیسے خیال کرلیا کہ آپ نے ان سے کوئی مسئلہ پوچھا ہوگا، یہ بھی تو ہوسکتا ہے بلکہ اغلب یہی ہے کہ آپ نے ان سے یہ دریافت کیا ہوگا کہ میری پیشین گوئی تمہاری کتابوں میں ہے یا نہیں، اور اس سوال کا منشاء صرف ان کی صداقت کا امتحان کرنا تھا۔

حدیث مذکور میں مشرکین اور نصاریٰ کا رد

اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس حدیث سے مشرکین ونصاریٰ کے اعتراض مذکور کا

نہایت بلیغ رد ہوتا ہے تقریر اس کی یہ ہے کہ یہود سے آنحضرت ﷺ نے کوئی بات پوچھی، اور یہود نے صحیح جواب کے بجائے غلط جواب دیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہود کے فعل کی مذمت فرمائی، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ مبعوث ومرسل من اللہ نہ ہوتے، بلکہ یہود ونصاریٰ کی سنی سنائی باتوں کو وحی بنا کر پیش کرتے ہوتے، تو یہود کے اس غلط جواب کو بھی وحی کی صورت میں پیش کر دیتے، حالانکہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ آپ نے اس کا غلط وخلاف واقع ہونا ظاہر فرمایا، لہٰذا معلوم ہوا کہ آپ کو یہود ونصاریٰ کی باتوں پر قطعاً اعتماد نہیں تھا، اور نہ ان کی باتوں کو وحی بنا کر پیش کرتے تھے بلکہ آپ کا اعتماد صرف وحی الٰہی پر تھا اور آپ کی تعلیمات کا مدار صرف وہ چیز تھی جس کو خدا آپ پر القاء کرتا تھا۔

”حق گو“ اور اس کے ہم اعتقاد دوگونہ عذاب میں

پھر حق گو صاحب سے ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کے خیال میں تو حدیث کی اشاعت عباسیوں کے زمانہ میں ہوئی ہے (صفحہ ۴۱) لہٰذا مشرکین عہد نبوت کے الزام کی بنیاد حدیثوں پر تو ہو نہیں سکتی، کوئی اور چیز ہوگی جس پر اس الزام کی بنیاد مشرکین نے قائم کی ہوگی، مجھے اس بنیاد کی تعیین کی کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ چاہے جو بنیاد بھی ہو، دو حال سے خالی نہیں ہے، ایک یہ کہ وہ بنیاد صحیح ہو (معاذ اللہ) اس صورت میں حدیثوں کا انکار محض حماقت ہوگا، اس لئے کہ حدیثیں اصل بنیاد الزام تو ہیں نہیں کہ ان کے انکار سے اصل بنیاد الزام بیخ وبن سے اکھڑ جائے پس کہاں کی عقل مندی ہے کہ حدیثوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور الزام بھی دفع نہ ہوا، اور اگر وہ بنیاد غلط ہو (اور واقعہ بھی یہی ہے بلکہ الزام کی درحقیقت کوئی بنیاد نہیں ہے) تو بھی انکار حدیث خالی از حماقت نہیں، اس لئے کہ اصل بنیاد کا قلع قمع ہو جانے سے جب مشرکین کا دعویٰ ہباءً منثورا ہو چکا تو اب تائید وشہادت کو معرض بحث قرار دینا اور

اس کے رد و قبول کے درپے ہونا کھلی ہوئی بے عقلی ہے۔

مخالفین کے اعتراضات کی بنیاد صرف بغض و عناد پر ہے

حق گو صاحب دراصل عقل سے ذرا کم کام لیتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ مخالفین اسلام کے اعتراضات حدیثوں سے پیدا ہوتے ہیں حالانکہ یہ محض فریب ہے مخالفین اسلام کے اعتراضات تو صرف عناد و بغض اور عداوت سے پیدا ہوتے ہیں اگر حدیثوں سے پیدا ہوتے تو اس زمانہ میں اعتراض کیوں پیدا ہوتا کیا آپ کو قرآن مجید میں یہ آیات نہیں ملیں۔

﴿وقال الذين كفروا ان هذا الا افك افتراه واعانه عليه قومٌ آخرون فَقَدْ جَاءُ وا ظلمًا وزُورًا وقالوا اساطير الاولين اكتتبها فهي تملى عَلَيْهِ بكرة واصيلا﴾

یعنی کافروں نے کہا کہ یہ قرآن تو بس جھوٹ ہے جس کو نبی عربی نے بنا لیا ہے، اور دوسروں نے اس افتراء میں ان کی مدد کی ہے (خدا کہتا ہے کہ) کافروں کا یہ سراسر ظلم اور صریح جھوٹ ہے کافروں نے یہ بھی کہا کہ یہ تو پہلوں کے افسانے ہیں جن کو محمد (ﷺ) نے لکھوا لیا ہے پس وہ افسانے صبح و شام ان پر املاء کئے جاتے ہیں (اور وہ ان کو لکھتے رہتے ہیں)۔

دیکھئے ان آیات میں اس زمانے کا اعتراض مذکور ہے جب بخیال ”حق گو“ صاحب حدیثیں تھیں ہی نہیں۔

انکار حدیث کے بعد بھی معترضین کا منہ بند نہیں ہو سکتا

اسی سے ”حق گو“ صاحب کی ایک اور غلط کاری ظاہر ہو گئی وہ یہ کہ انہوں نے مخالفین کے الزامات کو رفع کرنے کے لئے انکار حدیث کی جو راہ نکالی ہے وہ بالکل غلط اور بے نتیجہ ہے اس لئے کہ حدیثوں کو بے اعتبار کرنے کے بعد بھی مخالفین کے

اعتراضات بند نہیں ہو سکتے آخر جب حدیثیں نہیں تھیں تو مخالفین نے اعتراضات کس طرح کئے اسی طرح حدیثوں کے انکار کے بعد کرتے رہیں گے۔

حدیث مذکور کو غلط کہنے کی دوسری وجہ اور اس کا جواب

''حق گو'' صاحب نے اس حدیث کے غلط ہونے کی دوسری وجہ یہ لکھی ہے کہ اس کے مخالف ایک دوسری روایت بھی آئی ہے، حالانکہ کوئی روایت مذکورہ بالا حدیث کی مخالفت میں وارد نہیں ہوئی، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیت:

﴿لا تحسبنّ الذین یفرحون الآیة﴾

کا ایک دوسرا شانِ نزول جو مروی ہے وہ مذکورہ بالا شانِ نزول کے مخالف نہیں ہے، بلکہ صورت یہ ہوئی ہے کہ دونوں واقعے یکے بعد دیگرے اتفاق سے پیش آئے، اور چونکہ دونوں واقعوں میں اپنی بے جا تعریف کی خواہش منافقین و یہود نے ظاہر کی تھی، اس لئے آیت دونوں پر برابر چسپاں تھی، پس جب آیت کا تعلق دونوں واقعوں سے تھا، تو اگر ایک صحابی نے یہود کے واقعہ کو اور دوسرے نے منافقین کے قصہ کو شانِ نزولِ آیت قرار دیا تو اس میں کوئی تعارض و تصادم اور تخالف نہیں ہے۔

تیسری وجہ اور اس کی تغلیط

''حق گو'' صاحب نے اس حدیث کے غلط ہونے کی تیسری وجہ یہ بیان کی ہے کہ:

> ''ابن عباس آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بالکل کمسن بچے تھے لہٰذا مروان ان سے یہ کیسے دریافت کر سکتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس آیت کے بارے میں کیا سنا ہے۔''

''حق گو صاحب کی یہ تیسری وجہ ان کے مبلغِ علم کی صاف پردہ دری کر رہی

ہے، اولاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما عہد نبوی میں بالکل کمسن بچے نہ تھے، بلکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا خود بیان ہے کہ وہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قریب بہ بلوغ تھے[1] اور مورخین نے تصریح کی ہے کہ وہ وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت ۱۳ سال کے تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سننے اور سمجھنے کے لئے یہ بہت کافی سن ہے بالخصوص شریف گھرانوں اور عمدہ تربیت کے لڑکے تو اس سن میں بہت ذہین وہوشیار ہو جاتے ہیں، لہذا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو خود حضور علیہ السلام کی زبان فیض ترجمان سے سننا مستبعد ہے نہ محل تعجب، ثانیاً روایت میں یہ ذکر بھی نہیں ہے کہ اے رافع! ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ پوچھنا کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں کیا سنا ہے۔ روایت میں تو صرف اتنا ہے کہ اے رافع! ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کے پاس جا کر ہمارا یہ اشکال پیش کر دے، معلوم ہوتا ہے کہ "حق گو" صاحب اپنا لکھا ہوا بھی نہیں سمجھتے۔

پھر حق گو صاحب نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بالکل کم سن ثابت کرنے کے لئے یہ لکھا کہ:

> "ان کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس وقت جب کہ وہ لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، معاویہ کے پاس بھیجا، اور معاویہ فتح مکہ کے بعد مسلمانوں میں شامل ہوئے، لہذا معلوم ہوا کہ وہ فتح مکہ تک بالکل بچے تھے۔"

لیکن "حق گو" صاحب کی یہ ساری قیاس آرائیاں غلط ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فتح مکہ کے سال گیارہ برس کے تھے، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بے شک فتح کے بعد مسلمانوں میں شامل ہوئے، لیکن جس روایت میں ان کے بلانے کا ذکر ہے، اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسلمان ہونے کے بعد بلایا، اور

---

[1] بخاری: ۱/۷۱

جب یہ تصریح نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ قبل اسلام آنحضرت ﷺ نے ان کو بلایا ہو، اور اس وقت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ایسے کمسن ہوں کہ بچوں کے ساتھ ساتھ کھیلتے رہتے ہوں، ”حق گو“ صاحب بتائیں کہ انہوں نے کس دلیل سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بلانے کے واقعہ کو فتح مکہ کے بعد مانا ہے۔

”حق گو“ کی تاریخ سے افسوسناک بے خبری

”حق گو“ صاحب نے اسی بحث میں اپنی بے نظیر ”تاریخ دانی“ کا ثبوت بھی دیا ہے، فرماتے ہیں کہ:

> ”آنحضرت ﷺ نے حضرت میمونہ سے فتح مکہ کے بعد نکاح کیا ہے۔“

حالانکہ اب تک سارے مورخین و محدثین یہی جانتے تھے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے ۷ھ میں عمرۃ القضاء کے سفر میں نکاح ہوا ہے۔[1]

”حق گو“ صاحب کا ایک اور لطیفہ بھی ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:

> ”راوی نے ابن عباس کو جو بدنام کیا، اس کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی بجز اس کے کہ حدیث کی اشاعت عباسیوں کے عہد میں ہوئی اور ابن عباس کا نام اپنے ساتھ بہت سی دنیوی برکات اپنے ساتھ لئے ہوئے تھا۔“

لیکن ”حق گو“ صاحب نے اس کی کوئی توجیہ نہ کی کہ راوی نے عباسیوں کے دشمن مروان اموی کا نام لیا، آخر مروان نام پر عباسیوں سے کس نفع کی توقع تھی، اور ”حق گو“ صاحب نے اس کا بھی کچھ لحاظ نہ کیا کہ وہ خود (صفحہ ۴۳) میں لکھتے ہیں کہ ابن شہاب زہری نے بھی حدیث کی ایک کتاب لکھی ہے اور ابن شہاب کا زمانہ عباسیوں سے پہلے ہے پھر ان کا یہ فرمانا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ عباسیوں کے عہد میں

---

[1] بخاری: ۲/٦۱۱ بروایت ابن اسحق، وزرقانی: ۲/٢٦٢، ۳/۲۵۰، زاد المعاد: ٤/۲۵۷

حدیث کی اشاعت ہوئی۔

حق گو صاحب نے دوسرا عنوان یوں قائم کیا ہے:

آنحضرت ﷺ کی خواہشات نفسانی کے لئے خدا وحی اتارا کرتا ہے اور اس کے ثبوت میں یہ حدیث ذکر کی ہے۔

> ”حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ یہ عورت شرم نہیں کرتی ہے جو اپنے تئیں بخش دیتی ہے، آنحضرت پر یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری ”ترجی من تشاء منھن الخ“ تب میں نے کہا آپ کا رب آپ کی خواہشات نفسانی کے مطابق (وحی اتارنے میں) جلدی کرتا ہے۔“

اور اس کے بعد لکھا ہے کہ:

> ”یہ کسی زندیق کا قول ہے جو بیک وقت آنحضرت ﷺ ہی پر نہیں بلکہ خدائے قدوس پر بھی حملے کر رہا ہے، قرآن میں یہ آیت آپ کی منکوحہ بیویوں کے بارے میں ہے، سیرۃ حلبی والے نے غالباً اسی روایت سے متاثر ہو کر یہ کہہ دیا، کہ آپ پر بلا شرط نکاح عورتیں حلال کی گئی تھیں۔“

ہویٰ کے معنی

”حق گو“ صاحب میں بڑا عیب یہ ہے کہ احادیث کی خود اپنے جی سے ایک غلط تشریح کرتے ہیں پھر اسی تشریح کی بنیاد پر حدیثوں کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حدیث مذکورہ بالا میں ایک لفظ ”ھوی“ کا واقع ہے، اس کا ترجمہ ”حق گو“ صاحب نے خواہشات نفسانی کر کے ایک بے ہودہ الزام قائم کر دیا، حالانکہ صحیح ترجمہ[1] ہویٰ کا رضا اور پسند ہے، اور اس فقرہ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مرغوب و پسندیدہ چیز کی اجازت دینے میں اللہ تعالیٰ دیر نہیں کرتا، اور یہ مفہوم خود

---

[1] جیسا کہ خود راوی حدیث نے ہوی کی تفسیر رضا سے کردی ہے۔ مسند احمد

قرآن کریم سے ثابت ہے "ولسوف یعطیك ربك فترضى" یعنی "البتہ بہت جلد اللہ تعالیٰ آپ کو دے گا (جو آپ چاہیں گے) پس آپ خوش اور راضی ہو جائیں گے۔" دیکھئے یہ آیت صاف بتارہی ہے کہ خدا آپ کے مرغوبات آپ کو ضرور عطا کرے گا، اور آپ کی خوشی ضرور پوری کرے گا، اور اسی مضمون کو حدیث میں بھی بیان کیا گیا ہے، اب اگر "حق گو" صاحب یہ کہیں کہ ہویٰ کا صحیح ترجمہ خواہشات نفسانی ہی ہے تو میں کہوں گا کہ اس مقام پر ہویٰ کا یہ ترجمہ کرنا انتہائی بدبختی زندقیت اور دشمنی واہانت رسول اللہ ﷺ ہے، اگر "حق گو" صاحب کے دل میں مرتبہ رسالت کی عظمت اور انبیاء کی معصومیت ونزاہت کا احساس ہوتا تو وہ ہرگز اس کی جرأت نہ کرتے کہ اپنے جیسے گناہوں میں ملوث انسانوں پر انبیاء کو قیاس کر کے ان کے لئے نفسانی خواہشات ثابت کرتے، ہم یہ مان سکتے ہیں کہ لغت میں ہویٰ کے معنی مطلق خواہش کے ہیں، لیکن اس کے ساتھ نفسانی کا اضافہ غلط ہے اور خواہش کا نفسانی ہونا ہویٰ کے مفہوم کا جزو نہیں ہے، لہٰذا اگر کسی مقام میں محل وقوع کی مناسبت سے ہویٰ کے معنی خواہش نفسانی کر دیا گیا ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جہاں اس کا موقع نہ ہو وہاں بھی یہی ترجمہ کر دیا جائے "حق گو" صاحب کو یہ سوچنا چاہئے تھا کہ یہاں ہویٰ کا لفظ رسول اللہ ﷺ کے لئے بولا گیا ہے، اور رسول نفسانی خواہشوں سے منزہ ومعصوم ہوتا ہے لہٰذا اس لفظ کا ترجمہ نفسانی خواہش کرنا صرف غلط ہی نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی عصمت پر حملہ بھی ہوگا، کیا "حق گو" صاحب نہیں جانتے کہ مکر اور خداع کے الفاظ ہمارے محاورہ میں کیسے مکروہ معنی میں بولے جاتے ہیں، اور ان دونوں کو کفار ومنافقین کی مذمت کے سلسلہ میں قرآن نے استعمال کیا ہے پھر ان ہی الفاظ کا اطلاق قرآن میں خدا کے لئے بھی ہوا ہے۔ تو کیا "حق گو" صاحب یہاں بھی ان الفاظ کا وہی ترجمہ کریں گے جو کفار ومنافقین کے ذکر میں کیا جاتا ہے "حق گو" صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہویٰ کا لفظ عربی لٹریچر میں محبوب

و مرغوب شے کے لئے برابر بولا جاتا ہے ایک شاعر کہتا ہے

هوای مع الرکب الیمانین مصعد
جنیب و جثمانی بمکة موثق

(میرا محبوب یمنی قافلہ کے ساتھ چلا جا رہا ہے اور میرا جسم مکہ میں مقید و اسیر ہے)۔

اب میں چاہتا ہوں کہ حدیث مذکورہ اور اس میں جس آیت کی طرف اشارہ ہے، اس کی بھی مختصری تشریح کر دوں تا کہ ”حق گو“ صاحب کی غلط فہمی اور ابلہ فریبی اچھی طرح کھل جائے۔

حدیث زیر بحث اور آیت مذکورہ کی تشریح

حدیث و سیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض عورتیں زوجیت رسول ﷺ کا شرف حاصل کرنے کے لئے بغیر اس کے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے اس کی کوئی تحریک یا خواہش کا اظہار ہو، خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کرتی تھیں کہ ”وهبت نفسي لك يا رسول الله“ (میں نے اپنے تئیں آپ کے لئے بخش دیا) عورتوں کی اس بات پر حضرت عائشہ ؓ کو محض فطری حیا و غیرت کی بنا پر تعجب ہوا کہ ایک عورت فطرۃً خواہش زوجیت کے اظہار میں بے باک نہیں ہوا کرتی پھر ان عورتوں کو کیسے ہمت ہوتی ہے۔ کیا ان کو شرم نہیں لگتی حضرت عائشہ ؓ برابر اس پر متعجب رہا کرتی تھیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب کی ایک آیت میں ارشاد فرمایا کہ جو عورت اپنے نفس کو نبی کے لئے ہبہ کر دے، اس کو بھی ہم نے نبی کے لئے حلال کیا، بشرطیکہ نبی اس کو رکھنا چاہے، تو حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کا تعجب جاتا رہا، اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اگر یہ چیز شرعاً قابل حیا و شرم ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان عورتوں کو نبی کے لئے حلال کرنے کے بجائے ان کے فعل کی مذمت کرتا، پھر اسی

آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو اختیار بھی عطا فرمایا، کہ آپ اپنی بیبیوں میں سے جن کو چاہیں چھوڑ دیں یا ان کے لئے باری مقرر نہ کریں، اور جن کو چاہیں اپنے سے ملالیں، آپ کی جو مرضی ہو کریں، اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں دیکھتی ہوں کہ خدا تعالیٰ آپ کی جو مرضی ہوتی ہے اس کے پورا کرنے میں دیر نہیں کرتا، ایک ای کو دیکھئے کہ ساری بی بیوں کو رکھئے یا ان سب کے لئے باری مقرر کرنے کو ضروری قرار دیا جاتا تو ممکن تھا کہ حضور ﷺ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف یا طبیعت پر گرانی ہوتی اس لئے اس معاملہ میں پورا پورا اختیار آپ کو دے دیا کہ آپ کی جو خوشی ہو کیجئے، حدیث مذکور کی سیدھی اور صاف تشریح یہ تھی کہ جس کو "حق گو" صاحب اپنی حدیث دشمنی کی وجہ سے نہ سمجھ سکے، اور خواہ مخواہ راوی حدیث پر برس پڑے، اب اس کے بعد آیت کو ملاحظہ کیجئے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۚ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ تُرْجِيْ مَنْ تَشَاۗءُ مِنْهُنَّ وَتُـــٔوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۭ﴾[1]

ترجمہ: "یعنی اے نبی (ﷺ) ہم نے آپ کے لئے یہ بیبیاں جن کو آپ ان کے مہر دے چکے ہیں حلال کی ہیں اور وہ عورتیں بھی جو آپ کی

---

[1] احزاب: آیۃ ۵۰، ۵۱

> مملوکہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو غنیمت میں دلوادی ہیں اور آپ کے چچا کی بیٹیاں، اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں، اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں، اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں، جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو، اور اس مسلمان عورت کو بھی جو اپنے تئیں پیغمبر کے لئے بخش دے بشرطیکہ اس کو نکاح میں لانا چاہیں یہ آپ کے لئے مخصوص ہے، نہ اور مومنوں کے لئے (اور مومنوں کے لئے دوسرے کچھ احکام ہیں) ہم کو وہ احکام معلوم ہیں جو ہم نے ان پر ان کی بیبیوں اور لونڈیوں کے بارے میں مقرر کئے ہیں، اور ہم نے مذکورہ بالا حکم کو صرف آپ کے لئے اس واسطے نافذ کیا) تاکہ آپ کو کسی قسم کی تنگی نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، ان (بیبیوں) میں سے آپ جس کو چاہیں اپنے سے دور رکھیں اور جس کو چاہیں اپنے نزدیک کرلیں، اور جن کو دور رکھا تھا ان میں سے پھر کسی کو طلب کریں تب بھی آپ پر کوئی گناہ نہیں ہے۔"

اس آیت میں صراحۃً مذکور ہے کہ کوئی عورت خود اپنی ذات کو آنحضرت ﷺ کے لئے ہبہ کردے تو وہ عورت بھی آپ کے لئے حلال ہے بشرطیکہ آپ اس کو اپنے نکاح میں لانا چاہیں، اور یہ بھی تصریح ہے کہ یہ صورت آپ کے ساتھ مخصوص ہے، پس لازمی طور پر آیت کے اس جز کا یہی مطلب ہوگا کہ کوئی عورت خود کو بلا مہر و بلا عوض رسول اللہ ﷺ کی زوجیت میں دے دے اور یہ کہہ دے کہ میں نے اپنے آپ کو آپ کے لئے بخش دیا، اور آپ اس ہبہ کو قبول کرلیں تو یہ بھی نکاح کی ایک صورت ہے، اور وہ عورت رسول اللہ ﷺ کے لئے حلال ہو جائے گی، اور اس کا مہر حضور ﷺ کے ذمہ لازم نہ ہوگا، اور یہ صورت بجز آنحضرت ﷺ کے اور کسی کے لئے جائز نہیں، جو صاحب اس کے علاوہ کوئی اور مطلب نکالنا چاہیں وہ آیت کے دو لفظوں پر خصوصیت کے ساتھ غور کریں، اس کے بعد جو مطلب چاہیں بیان کریں

ایک ”وہبت نفسہا“ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اپنے نفس کو بلا عوض آنحضرت ﷺ کے لیے بخش دے، اس لئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہبہ مفت دینے اور بخشنے کو کہتے ہیں۔ دوسرے ”خالصة لك من دون المؤمنين“ یعنی یہ صورت خاص طور پر آپ کے لئے مشروع ہے، اور مسلمانوں کے لئے نہیں، لہذا جو مطلب بیان کیا جائے وہ ایسا ہو کہ دوسرے مسلمانوں کے لئے وہ جائز نہ ہو۔

پھر آیت میں یہ تصریح بھی موجود ہے، کہ یہ صورت نبی ﷺ کے لئے خاص اس لئے کی گئی تا کہ آپ کو کسی قسم کی تنگی نہ ہو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس حکم کی مشروعیت آنحضرت ﷺ سے تنگی دفع کرنے کے لئے اور اس لئے ہے کہ آپ رنجیدہ نہ ہوں بلکہ آپ خوش رہیں اب انصاف سے بتائیں کہ حدیث مذکور میں قرآن مجید سے زائد بات کیا بیان کی گئی ہے۔

اس کے بعد میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں، کہ اس آیت میں جو اختیارات آنحضرت ﷺ کو عطا فرمائے گئے ہیں، ان کی نسبت قرآن مجید کی مدد سے کوئی شخص نہیں بتا سکتا کہ آپ نے ان سے کوئی فائدہ اٹھایا کہ نہیں، ہاں حدیث بتاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مذکورہ بالا قسم کی کسی عورت کو اپنی زوجیت میں قبول نہیں فرمایا[1] اسی طرح آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہرات میں سے کسی کو علیحدہ نہیں کیا، نہ کسی کی باری بند کی نہ کسی کی باری کم کی یا زیادہ کی، خالص مساوات کے اصول پر سب کی باریاں مقرر رہنے دیں۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کو یہ اختیارات حاصل کرنے کی خواہش نہ تھی، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ اختیارات حاصل ہونے کے بعد ان سے فائدہ نہ اٹھاتے، اور یہیں سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حدیث مذکور میں ہوی کا ترجمہ خواہشات نفسانی کرنا خلاف واقع ہونے کے علاوہ سخت بدبختی

---

[1] فتح الباری: ۸/۳۷۲ بروایت ابن عباس

[2] فتح الباری بروایت زہری و قتادہ ۸/ ۳۷۳

اور خبث طینت کی دلیل ہے اس لئے کہ یہاں تو حضور علیہ الصلاۃ والسلام کو کوئی خواہش تھی ہی نہیں۔

صاحب سیرۃ حلبی پر افتراء

چلتے چلتے ''حق گو'' صاحب سیرۃ حلبی پر بھی ایک افتراء کر گئے سیرۃ حلبی میں آنحضرت ﷺ کی خصوصیات میں بلا نکاح عورتوں کا حلال ہونا کہیں بھی مذکور نہیں ہے، ہاں بلفظ ہبہ نکاح کا منعقد ہونا اور مہر کا واجب الاداء نہ ہونا البتہ خصوصیات رسول اللہ ﷺ میں مذکور ہے، اور یہ خصوصیات قرآن سے ثابت ہے۔

''حق گو'' نے تیسرا عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ مسحور کئے جاتے ہیں

اور اس کے ثبوت میں آنحضرت ﷺ کے مسحور ہونے کا واقعہ صحاح سے نقل کیا ہے لیکن اس سے پہلے آپ نے ایک تمہید لکھی ہے جس میں اپنی قرآن دانی کے لئے ایسے موتی لٹائے ہیں جن سے اپنے ناظرین کے جیب و دامن کو محروم رکھنا میں پسند نہیں کرتا، فرماتے ہیں:

> ''قرآن شریف کی سب سے آخر میں جو سورتیں ہیں، اور جو ان سے ما قابل ہیں، وہ بالکل تاریخی ترتیب سے لگی ہوئی ہیں (مگر ترتیب الٹی ہے) اوّل بہت چھوٹی چھوٹی مختصر سورتیں ہیں، جیسے مبتدی کو پہلے چھوٹے چھوٹے پھر طولانی عبارتیں سکھائی جاتی ہیں، خدائے تعالیٰ نے اس اصول فطرت کی بنا پر اپنے برگزیدہ نبی پر وحی نازل کی ہے اب دیکھو ان سورتوں کے معنی سے کیا صورت پیدا ہوتی ہے۔
>
> ایک جویائے حق تنہا بے آب و دانہ (جس کی یادگار میں ہم ہر سال ان دنوں میں روزہ رکھتے ہیں) غار حرا میں بیٹھا کائنات کے وجود اور

راز فطرت کے سمجھنے کے لئے مراقبہ کر رہا ہے تاریکی وحشت میں ایک ایک قسم کا خوف دل میں سما جاتا ہے، کہ وحی کی آواز آتی ہے "قل اعوذ برب الفلق" پھر "قل اعوذ برب الناس" آنحضرت کا قلب اس سے مطمئن ہوتا ہے، اور یکسوئی حاصل ہوتی ہے تو "قل ھو اللہ احد" کی آیت اس راز کا انکشاف کرتی ہے جس کے لئے وہ پریشان و سرگرداں تھے آپ کمربستہ ہو کر اٹھتے ہی اپنی قوم کو دعوت دیتے ہیں، بوڑھا بدبخت چچا آپ کا مذاق اڑاتا ہے، آپ دل گرفتہ ہو کر پھر غار حرا کا رخ کرتے ہیں، وحی الٰہی آپ کو تسکین دیتی ہے "تبت یدا ابی لھب الایۃ" آپ قوی دل ہو کر پھر قوم کے پاس آتے ہیں، اور فرمان الٰہی کو "قل یا ایھا الکافرون" کے الفاظ میں سناتے ہیں، اور ان سے ترک موالات کا اعلان کرتے ہیں کفار کی طرف سے آپ کو ایذائیں دی جاتی ہیں آپ پھر بے دل ہوتے ہیں، وحی آپ کو آئندہ فتوحات کا نقشہ دکھلاتی ہے "اذا جاء نصر اللہ والفتح الخ۔""

"حق گو" کے شاعرانہ تخیلات

"حق گو" کے ان عجیب وغریب تخیلات کی داد دیے بغیر ہم نہیں رہ سکتے تھے، اگر کاش انہوں نے یہ بھی بتا دیا ہوتا کہ ان کے ان تخیلات کا ماخذ کیا ہے، اور ان کے لئے وہ کون سا ثبوت اپنے پاس رکھتے ہیں۔

اگر حق گو کے پاس کوئی ثبوت و ماخذ نہیں ہے، صرف ان کے تخیلات ہیں تو وہ بتائیں کہ ان کے تخیلات میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ مسلمان اسی کو قبول کریں اور جو لوگ علم و عقل، فہم و ذکاوت، دین و دیانت میں "حق گو" سے بدرجہا بہتر و برتر ہوں ان کے تخیلات رد کر دیں، اور اگر "حق گو" اپنی باتوں کا کوئی ثبوت

رکھتے ہوں، تو میرے ان سوالات کا جواب جلد از جلد شائع کر دیں۔

قاہر سوالات

❶ آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ قرآن کی آخری سورتوں کی ترتیب بشرطیکہ موجودہ ترتیب کو الٹ دیا جائے بالکل تاریخی ہے، کیا آپ کسی تاریخ ہی سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ قرآن کی سب سے آخری سورتیں سب سے پہلے نازل ہوئیں؟

❷ آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ آنحضرت ﷺ غار حرا میں بے آب و دانہ مراقبہ کیا کرتے تھے۔

❸ تاریکی اور سناٹے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ پر خوف طاری ہونا اور اس کی وجہ سے "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَق" اور "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاس" کے نازل ہونے کا ذکر قرآن میں کہیں ہے، یا کسی تاریخ میں یا محض آپ کا قیاس ہے؟

❹ آپ نے (صفحہ ۲۸) میں لکھا ہے کہ:

> "قرآن کو الٹ کر تیسواں پارہ پہلا پارہ کر دو ایسا کہ آخری سورہ شروع میں پڑھی جائے اور اس کے بعد اس کے ماقبل کی سورتیں، تو تم کو معلوم ہوگا کہ اٹھائیسویں پارے تک قرآن کی جو ترتیب کاتبان وحی نے لگائی ہے وہ بالکل تاریخی ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جو سورت نازل ہوئی ہے "قل اعوذ برب الناس" ہے، اس لئے کہ موجودہ ترتیب میں سب سے آخری سورہ وہی ہے لیکن (صفحہ ۵) کی عبارت جو اوپر نقل کی گئی ہے، اس میں آپ نے تصریح کی ہے کہ پہلے "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الفلق" نازل ہوئی پھر "قل اعوذ برب الناس" اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کو قرآن کریم سے کتنا تعلق ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ آپ

قرآن پاک اٹھا کر کبھی دیکھتے بھی نہیں، اگر کسی بچے سے بھی پوچھ لیتے، تو وہ بھی آپ کو بتاتا کہ قرآن کریم کی سب سے آخری سورۃ "قل اعوذ برب الناس" ہے اگر آپ کہیں کہ میں جانتا ہوں کہ "قل اعوذ برب الناس" آخری سورہ ہے لیکن نزول میں وہ دوسرے نمبر میں ہے، لہٰذا عبارت (صفحہ ۵) بالکل صحیح ہے تو بتایئے کہ (صفحہ ۲۸) والی عبارت کی کیا تاویل ہے۔

⑤ ان دونوں سورتوں کے نزول سے آنحضرت ﷺ کے قلب کا مطمئن ہونا "قُلْ هُوَ اللّٰه" کے نزول کے بعد قوم کو دعوت دینا، بوڑھے بدبخت چچا کا مذاق اڑانا، ابولہب کا عم رسول (ﷺ) ہونا، اور آپ کا دل گرفتہ ہو کر غار حرا کا دوبارہ رخ کرنا وغیرہ، قرآن کریم کی تفسیر بالرائے کے ساتھ آپ کو یہ اختیار بھی ملا ہے، کہ اپنی عقل و قیاس سے واقعات بھی گھڑ لیں؟

⑥ کیا آپ کے قرآن میں "قل یا ایھا الکافرون" سے پہلے "اذا جاء" کی سورہ ہے، اگر نہیں تو ترتیب الٹنے میں "قل یا ایھا الکافرون" پہلے اور "اذا جاء" پیچھے کیسے ہوگئی۔ "حق گو" صاحب، اپنا کام کیجئے ان مباحث میں پڑ کر اپنی قرآن دانی کو کیوں رسوا کرتے ہیں۔

⑦ سوال نمبر ۱، ۲، ۳ وغیرہ کا جواب یا تو قرآن سے دیجئے، یا کم از کم تاریخ سے لیکن تاریخ سے جواب دینے کی صورت میں یہ بتانا ہوگا کہ جب تاریخ و حدیث دونوں کا مدار روایت و نقل پر ہے، تو تاریخ معتبر اور حدیث نامعتبر کیوں ہوگئی، حالانکہ حدیث کی روایتی حیثیت تاریخ سے بہت زیادہ مستحکم اور ٹھوس ہے۔

تاریخی واقعات قیاس سے ثابت نہیں ہوسکتے

مجھے یہ حیرت ہے کہ "حق گو" صاحب بایں ہمہ ادعائے ہمہ دانی اب تک یہ نہیں جانتے کہ تاریخ قیاس کی دسترس سے باہر ہے، تاریخی واقعات یا کسی کے

حالات زندگی محض قیاس سے بیان نہیں کئے جا سکتے، بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے، کہ اس شخص کا زبانی یا تحریری بیان بلا واسطہ یا بواسطہ نقل در نقل پیش کیا جائے، جس نے ان واقعات و حالات کا مشاہدہ کیا ہو، اگر ایسا نہ ہو تو ہر شخص کو اختیار ہوگا، کہ وہ اپنے قیاس سے جس عہد کی چاہے، تاریخ مرتب کر لے، اور جس شخص کے حالات زندگی اپنے تخیل سے جس طرح چاہے لکھ دے۔

حدیث سحر پر ''حق گو'' کے اعتراضات

اتنی گزارش کے بعد سنئے ''حق گو'' صاحب آنحضرت ﷺ کے مسحور ہونے کے واقعہ کو ان وجوہ سے غلط قرار دیتے ہیں۔

① اگر یہ واقعہ صحیح ہو تو ان کفار کی تصدیق ہوتی ہے، جو آپ کو بطور اتہام کے ساحر و مسحور بتاتے تھے۔

② کیا سردار انبیاء کی یہی شان ہے، کہ آپ پر یہودی کا جادو چل جائے۔

③ یہ واقعہ مدینہ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے زمانے کا بیان کرتی ہیں، تو کیا کوئی شخص بتا سکتا ہے، کہ اس کا تعلق سب سے ابتدائی مکی سورتوں سے کیسے گھڑ لیا گیا۔

④ اس واقعہ کی تردید و تکذیب قرآن شریف کی یہ آیتیں کر رہی ہیں۔

﴿قَالَ الکافرون اِنْ تتبعُوْنَ الا رجُلاً مَسْحُورا وما انت بنعمة ربك بكاهِنٍ ولاَ مَجنوُن، والنجْم اذ هَوى ما ضَلَّ صَاحِبُكم وَمَا غوى۔﴾

جوابات

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی وجہ بھی صحیح اور واقعہ سحر کی تغلیط و تکذیب کے لئے کافی نہیں ہے، میں ''حق گو'' صاحب کی غلط فہمیوں کو ظاہر کرنے کے لئے ہر وجہ کا علیحدہ علیحدہ جواب لکھتا ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مسحور کہنے سے کفار کا کیا مقصد تھا

پہلی وجہ یہ ہے کہ ''حق گو'' صاحب نے بالکل غور نہیں کیا کہ کفار کا اتہام کیا تھا، اگر وہ قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھے ہوتے، تو ان کو معلوم ہوتا، کہ مشرکین مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کی تکذیب کے لئے مختلف راہیں اختیار کی تھیں، کوئی یہ کہتا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عقل میں کچھ فتور نہیں ہے، انہوں نے جان بوجھ کر خدا پر افتراء کیا ہے، (معاذ اللہ) اور کوئی کہتا تھا کہ نہیں ان کی عقل میں فتور ہے، اور وہ (خاک بدہن دشمناں) دیوانہ ہو گئے ہیں، اور ان کا دعوت نبوت نتیجہ جنون ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿افتری علی اللہ کذبا ام بہ جنۃ﴾

ترجمہ: ''یا انہوں نے جان بوجھ کر خدا پر افتراء کیا ہے، یا ان کو جنون ہے۔''

اور کوئی بدبخت بجائے مجنون کہنے کے آپ کو مسحور کہتا، لیکن منشا اس کا وہی تھا، کہ آپ مجنون ہیں، کسی نے آپ کی عقل پر جادو کر دیا ہے، جس کی وجہ سے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا ہے، کفار مکہ کہنے کو یہ سب کچھ کہتے تھے، لیکن وہ خود بھی سمجھتے تھے، کہ آپ کا دامن ان تہمتوں سے بالکل پاک ہے، اور تاریخ شاہد ہے کہ ان میں کے بہت سے صاحبان عقل و دانش نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے، اور واقعات نے بھی ان کے اتہامات کی لغویت دنیا پر ظاہر کر دی ہے بہرحال کفار کے اتہام کا منشاء صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ آپ کے دماغ میں خلل اور عقل میں فتور ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ اتہام صرف کفار مکہ لگایا کرتے تھے، چنانچہ اس اتہام کا ذکر قرآن پاک کی صرف مکی سورتوں میں ہے، مدینہ میں جو آپ کے مخالفین تھے، ان میں سے کسی نے بھی یہ اتہام نہیں لگایا۔

سحر کا اثر حضور ﷺ کی عقل اور قوت ادراک ویقین پر قطعاً نہیں ہوا

اس تمہید کے بعد سنئے کہ حدیث میں آنحضرت ﷺ پر جادو کئے جانے کا جو واقعہ مذکور ہے، وہ مدنی زندگی کا واقعہ ہے، اور مورخین نے تصریح کی ہے کہ یہ ۷ھ میں پیش آیا، دوسرے خود حدیث میں یہ تصریح موجود ہے کہ سحر کا صرف اتنا اثر آپ پر ہوا تھا کہ آپ کو خواہ مخواہ شبہ پیدا ہو جاتا کہ بی بی سے مقاربت کی ہے، حالانکہ آپ کو یقین ہوتا تھا کہ بی بی کے پاس گئے بھی نہیں ہیں، اور کھانا نہیں کھایا جاتا تھا، اور آنکھوں سے کچھ کم نظر آتا تھا، غرض یہ ہے کہ سحر کا اثر آپ کی عقل اور قوتِ ادراک ویقین پر بالکل نہیں ہوا تھا، پس ظاہر ہو گیا کہ کفار مکہ کے اتہام کی اس واقعہ سے قطعاً تائید نہیں ہوتی، اس لئے کہ اس اتہام کا مقصود تو یہ تھا کہ (معاذ اللہ) آنحضرت ﷺ کا دماغ ماؤف اور عقل میں خلل ہے، اور حدیث میں جو واقعہ مذکور ہے، اس سے فتورِ عقل یا خللِ دماغ نہیں ثابت ہوتا، بلکہ دوسرے عوارض جسمانی ثابت ہوتے ہیں، نیز کفار کی تائید اس واقعہ سے اس لئے بھی نہیں ہو سکتی، کہ کفار یہ اتہام مکہ میں لگایا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ آپ پر جادو کیا گیا ہے اور اس کی وجہ سے آپ کے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا، اور دعویٰ نبوت اسی خلل دماغ کا نتیجہ ہے، حالانکہ زمانہ قیام مکہ میں جس کی مدت تیرہ سال ہے، کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، پھر مدنی زندگی میں بھی پورے چھ سال تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی، پس اس واقعہ سے جو ۷ھ میں یعنی دعویٰ نبوت کے ۱۹ سال بعد ہوا، اس سے اتہام مذکور کی کیونکر تائید ہو سکتی ہے، کیا ”حق گو“ صاحب کو اتنی سمجھ بھی نہیں ہے کہ اتہام مذکور کی واقعیت اور کفار کی صداقت اس کے بغیر ممکن نہیں، کہ اتہام لگانے کے وقت آپ مسحور ہوتے، اور کفار کی تائید صرف ایسے واقعہ سے ہو سکتی ہے، جو اس وقت آپ کا مسحور ہونا ثابت

کرے، باقی وہ واقعہ جو دعویٰ نبوت کے ۱۹ سال بعد ہوتا ہے، اس سے کوئی تائید نہیں نکلتی، اور نہ وہ واقعہ آنحضرت ﷺ کی نبوت سے انکار کرنے کے لئے حجت بن سکتا ہے، اس لئے کہ اس صورت میں کفار سے پوچھا جائے گا، کہ اگر تم دعویٰ نبوت کو سحر کا اثر کہتے ہو تو سحر تو ۱۹ سال کے بعد ہوا، لہٰذا بتاؤ کہ ۱۹ سال تک کس اثر کے ماتحت آپ دعوئے نبوت کرتے رہے اور تم ۱۹ سال تک آپ کو مسحور قرار دے کر کیوں جھوٹ بولتے رہے، کیا ”حق گو“ صاحب کفار کے وکیل بن کر اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں؟ اگر نہیں دے سکتے ہیں تو کیوں کہتے ہیں کہ اس واقعہ سے کفار کی تائید ہوتی ہے۔

سحر کا اثر علاوہ سطحی ہونے کے عارضی تھا

حاصل کلام یہ کہ کفار جس وقت آپ کو سحر کے ساتھ متہم کرتے تھے، اس وقت بلکہ اس کے مدتوں بعد تک آپ مسحور نہیں ہوئے، اور جب آپ پر سحر کیا گیا، تو اس کا اثر آپ کی عقل وقوت اور اک ویقین پر مطلق کچھ نہ ہوا، حالانکہ کفار کے مسحور کہنے کا یہی مقصد تھا کہ (معاذ اللہ) آپ کا دماغ ماؤف تھا، پھر اس سحر کا اثر بھی آپ پر بنا بر قول اصح صرف تین دن یا چار دن تھا، اس کے بعد بالکل زائل ہو گیا، لہٰذا اس سے کفار کی کچھ تائید نہیں ہوتی۔

واقعہ سحر حضور کے نبی ہونے کی روشن دلیل ہے

بلکہ ”حق گو“ صاحب کے علی الرغم یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کی ایک روشن دلیل ہے، غور کیجئے کہ مدینہ سے دو سو میل کے فاصلہ پر آپ پر سحر کیا جاتا ہے، اور جادوگر یہودی کی بہن کہتی ہے کہ اگر آپ نبی ہوں گے تو من جانب اللہ آپ کو اطلاع ہو جائے گی اور اپنے دعوئی میں کاذب ہوں گے ان کو کچھ پتہ نہ چلے گا، تا آنکہ ان کی عقل جاتی رہے گی، حدیث میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بتا دیا جاتا ہے کہ کس نے جادو کیا، اور کہاں کیا اور اس کے دفینہ

کی کیا صورت ہے، اور اس اطلاع کے ذریعہ ظاہر کردیا جاتا ہے کہ آپ سچے ہیں۔

ساحر کی ناکامی و نامرادی

دوسری وجہ تکذیب واقعہ کی پہلے سے بھی عجیب ہے، یہود کا جادو چلا کہاں؟ اس نے چاہا تھا، کہ آپ کی عقل جاتی رہے، لیکن اس کی ہوس پوری نہ ہوئی، اور نبی ﷺ کی عقل پر کچھ اثر نہ ہوا، اور جو اثر ہوا، وہ فقط جسمانی عوارض کی شکل میں ہوا، اور انبیاء جسمانی عوارض و امراض سے منزہ نہیں ہیں، دیکھئے خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقولہ قرآن میں نقل فرمایا ہے ”انی سقیم“ (میں بیمار ہوں) اور فرمایا ”واذکر عبدنا ایوب اذ نادی ربہ انی مسنی الشیطان بنصب وعذاب“ (یعنی یاد کیجئے ہمارے بندے ایوب کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھ کو شیطان نے بیماری کی تکلیف اور عذاب پہنچایا)۔

انبیاء عوارض جسمانی سے مبرا نہیں ہوتے

معلوم ہوا کہ انبیاء بیماریوں سے مبرا نہیں ہوتے، اگر کہئے کہ انبیاء طبعی طور پر بیمار ہو سکتے ہیں، لیکن کفار و مخالفین دین کے ہاتھ سے ان کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا، تو یہ بھی غلط ہے، قرآن نے متعدد مقامات میں یہودیوں کی نسبت فرمایا ہے ”یقتلون النبیین بغیر حق“ یعنی یہودیوں نے بہتیرے نبیوں کو ناحق قتل کر دیا، اور تاریخوں سے ثابت ہے، کہ خود آنحضرت ﷺ نے کفار کے ہاتھوں سے بڑی بڑی اذیتیں اٹھائیں، سر مبارک زخمی ہوا، دندان مبارک شہید ہوا، اور ڈھیلوں اور پتھروں سے جسم شریف لہولہان ہو گیا، پس جب یہ عوارض انبیاء علیہم السلام کے جسم پر کفار و مخالفین کے ہاتھوں سے طاری ہو سکتے ہیں تو یہودیوں کے سحر سے جو عوارض طاری ہوئے، وہ کیوں ناممکن معلوم ہوتے ہیں، وہ بھی تو امراض و اسقام و عوارض جسمانی ہی ہیں، ہاں انبیاء کرام علیہم السلام اس بات سے بے شک معصوم و منزہ ہیں کہ کوئی مخالف ان کے

عقائد میں تبدیلی پیدا کر دے، یا ان سے خدائے تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرا دے، یا کسی نوع سے ان کو بہکا دے، یہ سب باتیں قطعاً ناممکن ہیں، اور اس معنی کے لحاظ سے کسی یہودی نصرانی، مجوسی یا مشرک کا جادو سید الانبیاء ﷺ بلکہ کسی نبی پر نہیں چل سکتا۔

"حق گو" کا جہل

اور تیسری وجہ اور بھی عجیب ہے "حق گو" صاحب محض اپنے تخیل سے معوذتین کو سب سے پہلی مکی سورتیں قرار دے کر پوچھنے لگے، کہ "سحر کا واقعہ تو مدینہ کا ہے پھر اس کا تعلق ان سورتوں سے کیسے گھڑ لیا گیا" اے جناب! معوذتین کو مکی سورتیں کہتا کون ہے، یہ سورتیں تو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں، واقعہ سحر کے علاوہ اور احادیث سے بھی انکا مدنی ہونا ثابت ہے، اور اس کے علاوہ دنیا میں جتنے قرآن ہیں، چاہے وہ جس فرقہ اسلامی کے لکھوائے اور چھپوائے ہوئے ہوں سب میں ان دونوں کو مدنی ہی لکھا ہے لہٰذا آپ سے یہ سوال ہے کہ آپ ان کو مکی کس دلیل کی بنا پر کہتے ہیں، آپ کے تخیل و توہم و قیاس ورائے کے سوائے کوئی دلیل ہو تو پیش کیجئے، اس لئے کہ کسی سورۃ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی ایک تاریخی واقعہ اور ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر کی ایک بات ہے، اس میں قیاس کو دخل نہیں ہو سکتا، لہٰذا کسی ایسے شخص کا بیان پیش کیجئے جس نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا ہو، یا جو اس وقت موجود رہا ہو، ہم ایسے ہی مستند تاریخی بیان کی بنا پر اس کے قائل ہیں کہ یہ سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں، ثبوت کے لئے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ صحابی رسول ﷺ کا بیان ترمذی (صفحہ ۴۱۲)، مسلم (جلد ۱ صفحہ ۲۷۲) میں دیکھئے۔

سورۂ فلق اور واقعہ سحر

نیز آپ کا خیال ہے کہ جب غار حرا میں تنہائی اور سناٹے کی وجہ سے آپ پر

خوف طاری ہوا تو یہ سورتیں نازل ہوئیں، لہٰذا بتائیے کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ حضور ﷺ پر خوف طاری ہوا، یہ کس تاریخ میں مذکور ہے، اور اس کے ساتھ یہ بھی بتائیے کہ سورہ فلق میں یہ جو مذکور ہے ہے کہ "وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ" (یعنی میں پناہ مانگتا ہوں گرہوں میں پھونکنے والی عورتوں کے شر سے) اس کا کیا مطلب ہے، اور اس کو حرا میں خوفزدہ اور متوحش ہونے کے (فرضی) واقعہ سے کیا تعلق ہے، اور کیا گرہوں میں پھونکنا سحر و جادو کا کنایہ نہیں ہے، اور کیا اس سے مفہوم نہیں ہوتا، کہ نبی پر بھی سحر کا اثر بصورت عوارض جسمانی ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اگر اثر ہونا محال ہوتا، تو اس سے پناہ مانگنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

"حق گو" کی قرآن مجید سے بے تعلقی

بہر حال سورہ فلق خود دلیل ہے، کہ اس سورۃ کا تعلق واقعہ سحر سے ہے، چوتھی وجہ تکذیب واقعہ کی پہلی تمام وجہوں سے بہت زیادہ عجیب اور قرآن کریم سے آپ کی بے تعلقی کی بین دلیل ہے، آپ کی پیش کردہ تین آیات میں سے کسی میں بھی یہ مذکور نہیں ہے، کہ انبیاء پر سحر کا اثر بصورت عوارض جسمانی محال ہے، لہٰذا میں نہیں سمجھ سکتا، کہ ان آیات سے واقعہ سحر کی کس طرح تکذیب ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلی آیت میں یہ دیکھ کر کہ مخالفین نے آنحضرت ﷺ پر مسحور ہونے کی تہمت لگائی ہے، پس اگر واقعہ سحر صحیح ہو، تو اس سے مخالفین رسول اللہ ﷺ کے اتہام کی تائید ہوگی، یہ لکھ مارا لیکن میں مخالفین کے مسحور کہنے کا مقصد اور اس اتہام کی تاریخ ذکر کر کے ثابت کر چکا ہوں کہ واقعہ سحر سے ان کے اتہام کی کسی طرح تائید نہیں ہوتی، رہی دوسری اور تیسری آیت تو ان میں آنحضرت ﷺ سے جنون اور گمراہی کی نفی کی گئی ہے، اور ظاہر ہے کہ جنون کا تعلق عقل و دماغ سے اور گمراہی کا تعلق اعتقاد و علم سے ہے، اور میں ثابت کر چکا ہوں کہ سحر کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی عقل

شریف و دماغ عالی میں نہ کوئی فتور پیدا ہوا، اور نہ آپ کے اعتقادات وعلوم پر اس کا کوئی اثر پڑا تھا، لہٰذا ان آیات کے خلاف کوئی بات واقعۂ سحر میں نہیں ہے، پس ان آیات کو واقعۂ سحر کی تکذیب کے لئے پیش کرنا آپ ہی کہئے کہ حماقت ہے یا نہیں۔

"حق گو" کا جدید قرآن

اس کے بعد میں "حق گو" صاحب سے پوچھوں گا کہ "وَقَالَ الکٰفرون ان تتبعون الّا رجُلاً مسحورًا" کس پارے کی آیت ہے، ہم نے قرآن کریم کے جتنے نسخے دیکھے ہیں، ان میں "وَقَالَ الظٰلمُون" ہے افسوس ہے کہ آپ کو اتنا بھی تعلق قرآن سے نہیں ہے، کہ اس کو صحیح لکھ یا پڑھ سکیں۔

"حق گو" صاحب نے چوتھا عنوان یہ رکھا ہے۔

شیطان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل ومنہ میں جگہ پاتا ہے (نعوذ باللہ)

اور اس عنوان کے ماتحت لکھا ہے "الم نشرح لك صدرك" کی تفسیر میں شق صدر کی روایت حدیث پڑھو اور "تلك الغرانیق العلی" کی تفسیر جس کی تصدیق علمائے مستند کررہے ہیں، پھر بہ طور طنز کے یہ بھی لکھا ہے۔

> "مگر راوی نے "ربِّ اشرح لی صدری" کی دعائے موسیٰ میں حضرت موسیٰ کے شق صدر کی روایت بیان نہ کی۔"

"حق گو" صاحب کا مطلب یہ ہے کہ شق صدر کی بعض روایتوں میں وارد ہوا ہے کہ فرشتہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک چاک کرکے اس میں سے خون کی ایک پھٹکی نکالی، اور کہا "یہ شیطان کا حصہ تھا" لیکن اس روایت کی بنا پر مذکورہ بالا عنوان قائم کرکے حدیث سے بدظن کرنا "حق گو" صاحب کی کج فہمی یا ابلہ فریبی ہے،

اس لیے کہ صحیح مسلم کی جس روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں اس میں صراحۃً یہ بھی مذکور ہے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے، جب آنحضرت ﷺ بالکل کمسن اور بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے، یعنی قبل از نبوت بلکہ قبل از بلوغ کا واقعہ ہے۔[1]

پس بچپن کے واقعہ کو نبوت کے بعد کا واقعہ ظاہر کرنا کتنی بڑی بددیانتی ہے، پھر یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی فطرت میں خیر وشر نیکی و بدی اور تقویٰ و فجور کا مادہ ودیعت رکھا ہے، ارشاد ہے "وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا" اور فرمایا "وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ" اور چونکہ انبیاء بھی انسان ہی ہوتے ہیں، لہٰذا اصل فطرت انسانی کے تقاضا سے ان میں بھی ابتدائے عمر میں سب قوتیں موجود ہوتی ہیں، جو دوسرے انسانوں میں ہوتی ہیں، مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام گمراہوں کو راہ پر لگانے، اور بدکاروں کو نیکوکار بنانے اور دلوں کی گندگیوں کو دور کرنے کے لئے مبعوث ہوتے ہیں، اس لئے بعثت بلکہ بلوغ سے پہلے ہی ان کے قلوب سے مادۂ فجور نکال کر پھینک دیا جاتا ہے، اور برائی کی طرف جو قوت مائل کرنے والی ہے، اس کو بالکل نیست ونابود کردیا جاتا ہے۔

معجزۂ شق صدر

شق صدر والی روایت میں یہی بیان ہے کہ وہ مادہ جس کا خاصہ بدی کی جانب مائل کرنا ہے، اور جس کی وجہ سے شیطان کی مرضی کے موافق کام صادر ہوتے ہیں، اس مادہ کو آنحضرت ﷺ کے قلب مبارک سے نکال کر پھینک دیا گیا، اور نبوت بلکہ بلوغ سے بہت پہلے بچپن ہی میں قلب شریف کو شیطانی تصرفات اور شیطانی وساوس وخطرات سے مامون ومصون کردیا گیا اور اصل فطرت انسانی کے لحاظ سے بدی کی طرف جو میلان ممکن تھا، اس کے دھبے دھوکر قلب مبارک کو صاف ستھرا اور آئینہ کی طرح روشن وشفاف بنادیا گیا، یہ حدیث شق صدر کا روشن مفہوم ہے، جس سے

---

[1] مسلم: ۱/۱۹۲، شرح شفا: ۲/۲۰۲

صاف ظاہر ہے کہ حدیث آنحضرت ﷺ کے قلب مبارک کو شیطانی تصرفات سے بالکلیہ صاف و پاک ثابت کرنا چاہتی ہے، مگر ''حق گو'' کو حدیث کی دشمنی میں اس کا الٹا اثر نظر آتا ہے سچ ہے۔

ع گل است سعدی و در چشم دشمنان خار است

''رب اشرح لی صدری'' کی تفسیر میں راویوں کا موسیٰ علیہ السلام کے شق صدر کا ذکر نہ کرنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ شق صدر آنحضرت ﷺ کی روایت جعلی نہیں ہے، اس لئے کہ اگر جعلی ہوتی تو جہاں جہاں شرح صدر کا لفظ ہوتا، وہاں ایک ایک روایت بنالی جاتی، مگر چونکہ ایسا نہیں ہے بلکہ راوی واقعات کا پابند ہے، اس لئے آنحضرت ﷺ کے شق صدر کا ذکر کرتا ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شق صدر کا ذکر نہیں کرتا کہ واقعہ یوں نہیں ہے۔

تلک الغرانیق العلی پر بحث

حدیث شق صدر کے بعد ''تلك الغرايق العلى'' والی جس روایت کی طرف ''حق گو'' نے اشارہ کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک بار سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی جب ''منوٰة الثالثة الاخرى'' پر پہنچے تو کسی شیطان نے یہ کلمات شرارت سے بک دیے ''تلك الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجی'' اس روایت کو غور سے پڑھئے، اور بتائیے کہ ان کو ''حق گو'' صاحب کے مدعا سے کیا تعلق ہے، اس میں یہ کہاں مذکور ہے کہ شیطان نے آنحضرت ﷺ کے ذہن مبارک میں یہ کلمات ڈالے تھے پھر اس روایت کا حوالہ دیکر مذکورۂ بالا عنوان قائم کرنا صریح فریب کاری ہے یا نہیں، تلاوت قرآن کے وقت کفار و مشرکین کی اس قسم کی شرارتوں کا ذکر تو خود قرآن کریم میں موجود ہے ''وَقَالَ الذين كفرُوا لا تسمعوا لهٰذا القرآن وَالغوا فيه لعلكم تغلبُون.'' یعنی کافروں نے کہا

کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس کی تلاوت کے وقت گڑبڑ مچاؤ، شور وغوغا کرو، شاید تم غالب آ جاؤ، اسی مضمون کا ذکر اوپر والی حدیث میں بھی ہے۔

اس کے بعد سنئے کہ جن علماء نے اس روایت کی تصدیق کی ہے، وہ صرف اتنے مضمون کی تصدیق کرتے ہیں[1] باقی یہ مضمون کہ شیطان نے یہ کلمات آنحضرت ﷺ کی زبان پر سہواً یا نیند کی حالت میں جاری کرا دیئے تو اس کا علماء نے سخت انکار کیا ہے، اور بڑے شد و مد سے اس کی تغلیط و تکذیب کی ہے۔[2] مولوی شبلی صاحب نعمانی نے سیرۃ النبی جلد اول میں اس بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا ماحصل وہی ہے، جو اوپر مذکور ہوا "حق گو" صاحب نے اپنے ناظرین کو سیرۃ النبی کا یہ مقام دیکھنے کا مشورہ دیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بحث کو اس میں پڑھ چکے ہیں لیکن تعجب ہے کہ اس کے بعد ان کو سطور بالا لکھنے کی کیونکر جرأت ہوئی۔

"حق گو" صاحب نے پانچواں عنوان یوں ذکر کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ مکر و خدع سے اپنے دشمنوں کو قتل کرا دیتے تھے

اور اس سرخی کے نیچے کعب ابن الاشرف یہودی کے قتل کا واقعہ نقل کر کے لکھا ہے:

> "میرے نزدیک آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک پر راوی نے ایک بدترین اتہام لگایا ہے، یقیناً نہ آپ اس قتل کے محرک تھے، نہ آپ کو اس کا علم تھا، کعب کو اس کے کسی عرب دشمن نے اپنے ذاتی عناد کی وجہ سے یا اس کی بعض بدکرداریوں کی پاداش میں قتل کر دیا ہوگا، اور چونکہ وہ

---

[1] فتح الباری: ۳۰۷/۸، شرح شفا: ۳۳۵/۲

[2] فتح: ۳۰۷/۸، شرح شفا: ۳۳۵/۲، ناسخ و منسوخ ص ۱۹۰، ۱۹۱ وغیرہ

آنحضرت ﷺ کی نسبت فتنہ انگیزی کر رہا تھا، اس لئے دشمنانِ دین نے قتل کی تہمت آپ کے سر لگادی۔"

"حق گو" صاحب اگر اپنے اس بیان پر کوئی کمزور سے کمزور تاریخی شہادت بھی پیش کردیتے تو ہم کو ان سے کوئی وجہ اختلاف نہ تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، بے دلیل اور بے ثبوت، پھر ہم کو حیرت ہے کہ جب وہ کعب کو بدکردار تسلیم کرتے ہیں، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ فتنہ انگیز بھی تھا، تو ایسے بدکرداروں اور فتنہ انگیزوں کے قتل سے آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک پر کون سا اعتراض پڑ سکتا ہے، کیا مہذب سے مہذب حکومتیں فتنہ انگیزوں کے ساتھ یہی برتاؤ نہیں کیا کرتیں؟ کیا قرآن میں "الفتنة اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ" یعنی فتنہ انگیزی کو قتل سے زیادہ سخت اور برا نہیں فرمایا ہے، کیا قرآن میں فتنہ پردازوں کی نسبت یہ حکم نہیں ہے، "وقاتلوھم حتی لا تکون فتنة" یعنی ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، کیا کعب وہی شخص نہیں ہے جس کی بابت مورخین یک زبان ہو کر بیان کرتے ہیں کہ وہ بدر کے مشرکین مقتولین کے نہایت پردرد مرثیے لکھ کر مکہ لے گیا، اور مشرکین مکہ کو انتقام لینے کے لئے برانگیختہ کیا[1] اور حرم کا پردہ پکڑوا کر اس کے لئے معاہدہ کرایا[2] قصیدوں میں آنحضرت ﷺ کی خوب توہین کی[3] مسلمان شریف خاتونوں کا نام لے کر اظہار تعشق کیا اور ان کی بے حرمتی کی[4] آنحضرت ﷺ کو خفیہ قتل کرادینے کی سازش کی[5] اور کفار قریش وغیرہ کو آنحضرت ﷺ کے قتل کے لئے ابھارا[6] اور آنحضرت ﷺ کی دعوت کرکے کچھ لوگوں کو متعین کردیا، کہ جب آپ تشریف لائیں، تو دھوکے سے آپ کو ہلاک کردیں[7] اور کیا کعب اس قوم کا رئیس و سردار نہیں

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۲

[2] فتح الباری: ص ۲۳۷، خمیس: ص ۵۱۷

[3] ابوداؤد، ترمذی، فتح: ص ۲۳۶

[4] فتح الباری: ص ۲۳۶

[5] تاریخ یعقوبی: ص ۱۲

[6] ابن سعد ابوداؤد: ۲/۲۱

[7] فتح: ص ۲۳۷

ہے جس نے خود انصار کے دو قبیلوں اوس و خزرج کو لڑا کر اہل اسلام کی بربادی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہا تھا۔[1] پھر اگر ایسے ننگ انسانیت وجود سے زمین پاک کر دی گئی، تو اس میں کیا قباحت ہے، کعب صرف آنحضرت ﷺ ہی کا دشمن نہیں تھا، بلکہ تمام انصار اور کفار قریش کا بھی دشمن تھا، اس نے اپنے خبث بطن سے سب کو عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا پس اس کو زندہ رہنے دینا ہی بڑا ظلم تھا، نہ کہ اس کا قتل کر دینا۔

اس روایت پر ’’حق گو‘‘ صاحب کی جرح اور اس کا جواب

اس کے بعد ’’حق گو‘‘ صاحب اس واقعہ کی روایت پر جرح کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

> ’’اول سوال تو یہ ہے کہ محمد بن مسلمہ (قاتل کعب مذکور) کون شخص تھے اگر صحابی تھے اور یقیناً جیسا کہ روایت سے ظاہر ہے کہ صحابی تھے تو خود ان کی روایت ہم تک براہ راست بغیر ایک دوسرے صحابی کی سند کے کیوں نہیں پہنچی، کیوں حضرت جابر کو بیچ میں ڈالا گیا۔‘‘

سبحان اللہ کیا جرح ہے، اولاً تو ہم ’’حق گو‘‘ صاحب کو بتانا چاہتے ہیں، کہ یہ محمد بن مسلمہ کی روایت نہیں ہے، بلکہ ان کا ایک فعل اور ایک واقعہ ہے، جس کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے، اور اس واقعہ کے وقت حضرت جابر رضی اللہ عنہ خود موجود تھے، بہتر ہوگا کہ آپ صحیحین پر ایک نگاہ پھر ڈال لیجئے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ محمد بن مسلمہ کا بیان نہیں نقل کر رہے ہیں، دوسرے اگر بالفرض حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہی نقل کیا ہوتا، تو اس میں کیا قباحت تھی، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سن میں محمد بن مسلمہ سے بہت چھوٹے تھے، اور کمسن صحابہ رضی اللہ عنہم بڑی عمر والے صحابہ رضی اللہ عنہم سے برابر روایت کرتے ہیں، اور صحابہ پر کیا موقوف ہے، آج بھی ایک مشہور

---

[1] اصابہ: ۸۸/۱

استاذ کے قدیم و معمر شاگردوں سے اس کے نوجوان اور کمسن شاگردوں کے پڑھنے کی صدہا نظیریں موجود ہیں، پس اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ باوجود شاگرد رسول ﷺ ہونے کے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد بھی ہو سکتے ہیں، اور چونکہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ۳۵ سال پہلے فوت ہوئے، اس لئے عمرو بن دینار ان سے براہ راست اس کو نہ سن سکے، بلکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اس کی روایت کی، محمد بن مسلمہ کی وفات ۴۳ھ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی وفات ۷۸ھ میں ہوئی۔[1] پس ''حق گو'' صاحب کا محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے پہلے وفات پانے کا انکار کرنا جہالت اور بے خبری ہے، اور اگر ''حق گو'' صاحب کا یہ خیال ہے کہ اس واقعہ کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کیوں بیان کیا، محمد بن مسلمہ کو بیان کرنا چاہئے تو میں ان سے پوچھوں گا کہ یہ کہاں کا اصول ہے، کہ جو واقعہ جس شخص سے تعلق رکھتا ہو بس وہی شخص بیان کرے تو قبول کیا جائے گا، ورنہ نہیں، اگر ''حق گو'' صاحب کا یہی اصول ہے تو پھر ان کے نزدیک سارا ذخیرہ تاریخ نامعتبر اور بے کار ہوگا، اس لئے کہ عموماً تاریخوں میں جن اقوام و اشخاص کے حالات لکھے گئے ہیں وہ خود ان کے بیان کئے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ دوسرے دیکھنے والوں کے بیانات ہیں، بہرحال یہ نہایت لغو جرح ہے، جس سے روایت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، خصوصاً جب کہ یہ واقعہ دوسرے طریق سے بھی ثابت ہے، چنانچہ حاکم نے مستدرک میں اس کو محمد بن ابی عبس رضی اللہ عنہ کی روایت سے ذکر کیا ہے، حضرت ابو عبس بھی مذکور کے قتل میں شریک تھے، یہ محمد بن ابی عبس انہی کے لڑکے ہیں، اور ابوداؤد و ترمذی نے عبداللہ بن مالک کی روایت سے بھی ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ اور طریقوں سے بھی یہ واقعہ مروی ہے۔

''حق گو'' صاحب کی دوسری جرح

اس کے بعد ''حق گو'' صاحب لکھتے ہیں:

---

[1] زرقانی: ۲/۸۰، تذکرۃ الحفاظ

> ”دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد بن مسلمہ پیدائشی مسلمان تھے، یا خود ایمان لائے تھے، بہر صورت ان کا آنحضرت کا ہمنام ہونا عجب معنی رکھتا ہے، کیوں کہ عرب میں آنحضرت ﷺ سے پہلے محمد کسی کا نام نہیں رکھا گیا، اور عرصہ تک آنحضرت کے اسم مبارک پر لوگ فرط ادب سے نام رکھنا جائز نہ رکھتے تھے۔“

جواب: ”حق گو“ صاحب کی قلت معلومات کا یہ حال ہے کہ وہ حضرت محمد بن مسلمہ ؓ کا کچھ حال نہیں جانتے، پہلے سوال میں بھی انہوں نے اس سے بے علمی کا اظہار کیا ہے، اور اس سوال میں بھی، حالانکہ محمد بن مسلمہ ؓ بہت مشہور صحابی ہیں، اور وہ آنحضرت ﷺ کے قدوم مدینہ سے پہلے حضرت مصعب بن عمیر ؓ کے ہاتھ پر ایمان لا چکے تھے،[1] بعثت سے ۲۲ سال پہلے پیدا ہوئے، اور ۴۳ھ میں وفات پائی۔[2]

بے علمی کا دوسرا مظاہرہ

ان کا یہ لکھنا ہے کہ:

> ”عرب میں آنحضرت ﷺ سے پہلے کسی کا نام محمد نہیں رکھا گیا۔“

حالانکہ آنحضرت ﷺ کی ولادت شریفہ سے کچھ پہلے بیس آدمیوں کا محمد نام رکھا گیا، اور ولادت کے بعد بھی یہ نام رکھا گیا، جن میں ایک محمد بن مسلمہ ؓ بھی ہیں۔[3] ہاں یہ صحیح ہے کہ ابتدائے آفرینش عالم سے لے کر ولادت شریفہ سے کچھ پہلے تک کسی کا یہ نام نہیں رکھا گیا لیکن جب عرب میں خبر مشہور ہوئی کہ نبی آخر الزماں کا زمانہ اب قریب ہے، اور ان کا نام محمد (ﷺ) ہوگا، تو بہت سے لوگوں نے اس توقع میں کہ شاید یہ دولت ہمارے ہی حصہ میں آئے اپنے لڑکوں کو اس نام سے موسوم

---

[1] مستدرک حاکم: ص ٤

[2] زرقانی: ٨/٢

[3] فتح الباری: ٣٥٨/٦

کیا۔[1]

”حق گو“ صاحب کا یہ کہنا کہ۔

”عرصہ تک فرط ادب سے یہ نام نہیں رکھا جاتا تھا۔“

بالکل صحیح ہے مگر یہ آپ کے مبعوث ہونے کے بعد کا واقعہ ہے، اور حضرت محمد بن مسلمہ ؓ کا یہ نام بعثت سے پہلے رکھا گیا ہے، باقی اس کے ثبوت ہونے میں صحیح مسلم کی جو حدیث انہوں نے نقل کی ہے، وہ ان کے مدعا کے خلاف ہے، اس لئے کہ اس میں آنحضرت ﷺ نے صراحۃً اجازت دی ہے کہ میرا نام رکھو مگر میری کنیت نہ رکھو۔

”حق گو“ صاحب کی تاریخ دانی

اس کے بعد ”حق گو“ صاحب لکھتے ہیں:

> ”کعب کا واقعہ قتل بدر کے بعد پیش آیا یا بقول شبلی ۳ھ شوال میں کعب بنی نضیر کا سردار تھا بنی نضیر سے آپ کی اس وقت کوئی مخالفت نہ تھی، نضیر کی عہد شکنی کا واقعہ جنگ احد کے بعد کا ہے، جب کہ بنی نضیر نے دو مسلمانوں کو دھوکے سے قتل کر دیا تھا، اور جب آنحضرت ﷺ ان کے پاس خون بہا لینے کے لئے گئے، تو انہوں نے آپ کے قتل کی سازش کی، اس کے بعد وہ لوگ جلاوطن کر دیئے گئے، اگر کعب کا واقعہ بدر کے بعد کا ہے، تو بنی نضیر نے فوراً عہد شکنی کیوں نہیں کر لی۔“

مجھے حیرت ہے کہ جس شخص کے معلومات کا یہ حال ہو وہ کسی علمی مسئلہ پر قلم اٹھانے کی کس طرح جرأت کرتا ہے، شبلی نے کہیں یہ نہیں لکھا ہے، کہ کعب شوال ۳ھ میں قتل ہوا بلکہ انہوں نے ربیع الاول ۳ھ لکھا ہے، کعب بنی نضیر کا سردار کیا

---

[1] فتح الباری: ۳۵۸/۶

معنی وہ اس قبیلہ ہی سے نہ تھا، یہ بھی غلط ہے کہ بنی نضیر سے آپ کی اس وقت کوئی مخالفت نہ تھی، اس لئے کہ ابوداؤ (جلد۲ صفحہ۱۲۲) زرقانی (جلد۲ صفحہ۸۱) اور فتح الباری (جلد۷ صفحہ۲۳۲) میں بسند صحیح مذکور ہے کہ قریش نے بدر کے بعد بنی نضیر کو آنحضرت ﷺ کی مخالفت پر ابھارا، اور بنو نضیر نے بدعہدی اور پیمان شکنی کا عزم مصمم کر کے آنحضرت ﷺ کے پاس ایک پیام بھی بھیجا، جس کا منشا دھوکے سے آپ کو قتل کر دینا تھا، اس سازش کا ذکر سیرۃ النبی (جلد۱ صفحہ۳۷۲) میں بھی ہے، یہ تین باتیں میں نے نمونہ کے طور پر لکھ دی ہیں، ورنہ ''حق گو'' صاحب نے انہی چند سطروں میں اور غلط بیانیاں بھی کی ہیں۔

کعب بن الاشرف کے قتل کا سبب

اس کے بعد میں ''حق گو'' صاحب کو بتانا چاہتا ہوں کہ کعب کے قتل کا واقعہ بنی نضیر کی دشمنی و عداوت کی بنا پر پیش نہیں آیا تھا، بلکہ خود اس کی ذاتی فتنہ پردازیاں اور بدمعاشیاں اس کا سبب تھیں، جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، اور خود آپ کو بھی اس کے ناپاک، فتنہ پرداز اور فتنہ انگیز ہونے کا اقرار ہے، پس گردن زدنی ہونے کے اتنے اسباب کو ناکافی سمجھ کر بنو نضیر کی مخالفت کا تلاش کرنا اور اس کے نہ ملنے پر اس واقعہ کا انکار کر دینا کیا سراسر حماقت نہیں ہے؟

پھر ''حق گو'' صاحب نے اتنا بھی نہ سمجھا کہ اگر کعب کے قتل کا سبب یہ ہوتا کہ وہ بنو نضیر سے تھا، اور بنو نضیر نے آنحضرت ﷺ کی مخالفت کی ہے، تو اس صورت میں حی بن اخطب، کنانہ اور سلام رؤسائے نضیر قتل کرائے جاتے، نہ کہ کعب، جو کہ نضیری نہ تھا، بلکہ عربی النسل طائی تھا۔

بنو نضیر کی جلاوطنی کس سنہ میں ہوئی

اس کے بعد میں ''حق گو'' صاحب کو یہ بھی بتا دوں کہ بنو نضیر کی عہد شکنی اور

جلاوطنی کا زمانہ اگرچہ بعض لوگوں نے جنگ احد کے بعد بتایا ہے لیکن قوی اور زیادہ مستحکم قول یہ ہے کہ ان کی جلاوطنی کا قصہ غزوۂ بدر کے چھ مہینے بعد پیش آیا، زرقانی نے شرح مواہب (جلد۲ صفحہ ۸۰) میں اسی کو قوی ثابت کیا ہے، اور حاکم کی مستدرک میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس کی تصریح ہے، اور بخاری میں بروایت زہری اسی کو پہلے ذکر کیا ہے، اور ابوداؤد والی روایت مذکورۂ بالا سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، اور ابن مردویہ وعبد بن حمید کی ایک روایت صحیحہ بھی اس کی مؤید ہے خلاصۂ کلام یہ کہ اولاً تو راجح اور قوی قول کی بنا پر بنونضیر کی جلاوطنی وعہد شکنی کا واقعہ غزوہ بدر کے چھ ماہ بعد پیش آیا، اور اگر غزوۂ احد کے بعد بھی پیش آیا ہو تو اس سے کعب کا واقعہ قتل کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لئے کہ اس کے قتل کا سبب بنو نضیر کی پیمان شکنی نہ تھی، "حق گو" صاحب نے اس کے علاوہ اور بھی کئی تاریخی غلطیاں کی ہیں جن سے ہم بخوف طوالت اغماض کرتے ہیں۔

خلفائے بنوامیہ وبنی عباس پر تبرابازی

اس کے بعد فرماتے ہیں:

> "میرے نزدیک یہ اتہام آنحضرت ﷺ پر محض اس لئے لگایا گیا ہے کہ خلفائے بنی امیہ وبنی عباس بلکہ ان کے بعد رؤساء والیانِ ملک کو اپنے اپنے مخالف کو دھوکے سے قتل کرادینے کے لئے سنت رسول کی ایک سند ہاتھ آجائے۔"

ہم کو "حق گو" صاحب کی اس بدحواسی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ کبھی تو وہ یہ لکھتے ہیں کہ حدیث کی اشاعت عباسیوں کی خلافت میں ہوئی (دیکھو صفحہ ۴) اور یہاں یہ ظاہر کیا کہ خلفائے بنی امیہ ہی کے زمانہ میں حدیث شائع ہوچکی تھی، اور اس کے ساتھ ہم کو ان کی مسلم دشمنی وقوم کشی اور مغرب زدگی ویورپ پرستی پر بھی بے حد

حیرت ہے نہیں معلوم ''حق گو'' صاحب کس قسم کے مسلمان ہیں کہ خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کو بلا استثناء نفس پرور خواہش پرست اور خونخوار و دغاباز قرار دیتے ہوئے ان کو شرم نہیں آتی، نہ علمائے محدثین کو ''نفس پروروں'' اور ''خونخواروں'' کا معین و مددگار کہتے ہوئے ذرا حیا دامنگیر ہوتی ''حق گو'' صاحب نے اس حدیث کے وضع کی ایک علت پیدا تو کی لیکن میرا دعویٰ ہے کہ وہ اور ان کے اعوان و انصار کسی خلیفہ یا والی ملک کا کوئی ایسا واقعہ نہیں دکھا سکتے کہ اس نے کسی دشمن کو دھوکے سے قتل کرا کے اس حدیث سے حجت پکڑی ہو۔

اس کے بعد ''حق گو'' صاحب سے پوچھتا ہوں کہ اگر ان کے خیال میں اس حدیث کے وضع کرنے سے یہ مقصود تھا، تو ذیل کی حدیثیں کیوں ''وضع'' کی گئیں۔

❶ جو شخص کسی معاہد کو بے وجہ قتل کردے، تو اس پر جنت حرام ہے، اس کو جنت کی ہوا بھی نہ لگے گی۔[1]

❷ ہر عہد شکن کے لئے قیامت میں اس کی بدعہدی کا ایک جھنڈا گاڑا جائے گا جس سے اس کی پیمان شکنی کو رسوا کیا جائے گا۔[2]

❸ فتح مکہ کے دن ابوسفیان اور ان کی بی بی ہندہ کو جس نے عم رسول حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبایا تھا، معافی دینا، اور نیز یہ اعلان کردینا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوجائے، اس کے لئے بھی امن کی ذمہ داری ہے۔[3]

اس قسم کی صدہا احادیث اور واقعات جو کتب احادیث میں مذکور ہیں، آخر وہ کس لئے وضع کئے گئے، ''حق گو'' صاحب ہوش کی بات کیجئے، عقل سے اتنی بیگانگی اچھی نہیں۔

''حق گو'' صاحب نے چھٹا عنوان یوں قائم کیا ہے۔

---

[1] بخاری، ابوداؤد، نسائی
[2] بخاری وغیرہ
[3] فتح الباری: ج ۸

آنحضرت ﷺ کا عکل وعرینہ کی قوم سے نہایت عذاب اور بے دردی سے انتقام لینا

اوائل صدی کے مسلمانوں پر حملہ

اس عنوان کے ماتحت اپنی مسلم دشمنی کا ثبوت دیتے ہوئے مسلمان قوم اور وہ بھی اوائل صدی ہجری کے مسلمانوں کی شان میں یوں قصیدہ خوانی کی ہے:

> ”اوائل صدی ہجری کے مسلمانوں میں بکثرت جنگ وفتوحات و خونریزی سے یہ ذہنیت پیدا ہوگئی تھی، کہ کسی شخص کے شرف وبزرگی کے لئے نہایت ضروری ہے، کہ وہ حد درجہ جنگ جو سنگ دل اور شہوت راں ہو، اسی ذہنیت میں ہماری حدیثیں وضع کی گئی ہیں اور راویوں کو آنحضرت کو اس رنگ میں دکھانے میں خاص مزہ آتا ہے۔“

مجھے سخت حیرت ہے کہ ایک مدعی اسلام جس کو متبع قرآن اور حقیقی مسلم ہونے کے دعویٰ کے ساتھ تاریخ کی پوری واقفیت کا بھی دعویٰ ہے، اس کے قلم سے مذکورہ بالا الفاظ کس طرح نکلے، حالانکہ اسلام کا ایک دشمن بھی اگر وہ شریف ہو تو ان کے لکھنے سے اس لئے پرہیز کرے گا کہ اس میں اس کے علم وواقفیت، اس کے انصاف و دیانت اور اس کی صداقت و راستی کی سخت توہین ہے، اوائل صدی ہجری کے مسلمانوں سے اگر صحابہ رضی اللہ عنہم مراد ہیں تو ”حق گو“ صاحب کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہئے، اس لئے کہ ان کے اس رافضیانہ حملہ کی زد حدیث پر نہیں، بلکہ براہ راست قرآن کریم پر پڑتی ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم کی جو مدح سرائی قرآن کریم میں کی گئی ہے، اس سے کوئی واقف قرآن بے خبر نہیں ہے، اور اگر تابعین واتباع تابعین مراد ہیں، تو یہ ان کی جہالت اور تاریخ سے ناواقفیت ہے، تاریخیں شاہد ہیں کہ ان کا دامن اخلاق

ان گندگیوں سے پاک تھا، بعض بعض افراد اگر ان بد اخلاقیوں کے مرتکب ہوں تو ان کی وجہ سے پوری جماعت کو متہم کرنا صریح ظلم ہے، اگر ’’حق گو‘‘ صاحب کہیں کہ میں ساری قوم کو متہم نہیں کرتا، بلکہ ان میں بعض ہی افراد کی ذہنیت خراب ہوئی اور انہی نے حدیثیں وضع کیں، تو میں کہوں گا کہ یہ بات نہایت بعید از قیاس ہے، کہ چند سنگدل اور شہوت ران اشخاص ایک بات رسول پاک ﷺ پر افتراء کریں، اور اہل علم وصلاح کی جماعت اس کو قبول وتسلیم کرلے، حالانکہ اس جماعت کا اصول یہ ہے کہ جس کی پابندی شریعت یا راست بازی میں ادنی اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے، اس کی روایتوں کو قبول نہیں کرتی، کتب جرح وتعدیل میں اس کی صدہا مثالیں موجود ہیں۔

کیا یہ قرآن کا انکار نہیں ہے؟

پھر غور تو کیجئے، کہ قرآن میں امت محمدیہ کو خیر الامم کا لقب عطا کیا گیا، اس کا امتیازی وصف نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا بتایا گیا ہے لیکن اگر اوائل صدی ہجری ہی کے مسلمان جنگ جو، سنگ دل اور شہوت ران تھے، اور ان اوصاف رذیلہ کو محبوب بنانے کے لئے رسول پاک ﷺ کو بھی ان اوصاف سے متہم کرتے تھے، تو مجھے ’’حق گو‘‘ صاحب بتائیں، کہ اس قوم کو خیر الامم کا لقب دینا کیونکر جائز ہو سکتا ہے، اور وہ نیکی کی بات بتانے والی اور برائی سے روکنے والی کیسے ہو سکتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ’’حق گو‘‘ صاحب ظاہر میں اگرچہ صرف حدیثوں کے منکر ہیں، مگر در پردہ قرآن کے بھی سخت مخالف ہیں۔

دشمنان اسلام کی بدگوئیوں کی صدائے بازگشت

اس کے بعد مسلمانوں کے آقا ومولی ﷺ کی شان عالی میں دشمنان اسلام نے جو گستاخیاں کی ہیں ’’حق گو‘‘ صاحب انکا اعادہ کرتے ہیں، اس لئے کہ ان کے نزدیک جملہ علمائے اسلام تو افتراء پرداز شہوت پرست اور عظمت وحرمت رسول اللہ

ﷺ کے احساس سے بے بہرہ تھے، لیکن ان کے یوروپین مقتدا اور پیشوا بالکل سچے اور معصوم ہیں فرماتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ اگر حدیث کی روایتوں کو صحیح مان لیا جائے تو آنحضرت باوصف اس کے کہ سن رسیدہ تھے، اور اپنی ساری جوانی کو ایک بوڑھی بیوہ کے ساتھ گزار چکے تھے ① ایک رات میں اپنی تمام بیویوں کے پاس ہو آتے تھے ② ہمیشہ خوبصورت عورتوں کو نکاح میں لانے کے خواہش مند رہتے تھے ③ جو بیوی جوانی سے ڈھل چکی ہوتیں، ان کو آپ طلاق دینے پر تیار ہو جاتے ④ کسی اجنبی عورت کا حسن دیکھ کر بے قرار ہو جاتے اور گھر پر آکر اپنی بیوی سے جو سامنے آجاتی، اگرچہ وہ کام کاج میں مشغول ہوتی حاجت برآری کر لیتے ⑤ خلاف وقت اپنی بیویوں کے پاس چلے جاتے اور اس پر بیویوں میں خوب جھگڑا ہوتا۔''

ہمارے ناظرین اس اقتباس کو اپنی طبیعت پر جبر کر کے پڑھیں، اور انصاف سے کہیں کہ کیا ''حق گو'' صاحب نے بد باطن عیسائیوں اور کمینہ فطرت آریوں کی ہو بہو نقل نہیں اتاری ہے، ہاں اگر فرق ہے تو یہ کہ عیسائی اور آریہ ایک حد تک معذور ہیں، اس لئے کہ ان کو اسلامی لٹریچر سے واقفیت بہت کم اور ان کے مذہبی معلومات نہایت محدود اور صحیح و غلط کی تمیز یکسر مفقود ہے، دوسرے وہ اپنی تیرہ درونی اور اس بغض و عداوت کی وجہ سے بھی جو ان کو اسلام و داعی اسلام علیہ السلام سے ہے، جھوٹ بولنے اور بے سروپا الزام تراشنے اور آنحضرت ﷺ کی شان میں دریدہ دہنی کرنے پر مجبور ہیں، اور ''حق گو'' صاحب اسلام کے مدعی اسلامی معلومات کا خزانہ اور اسلام و داعی اسلام علیہ السلام کے ''جاں نثار'' ہیں اس لئے وہ کسی طرح معذور نہیں ہیں۔

افسوس

گر مسلمانی ہمیں است کہ حق گو دارد
وے اگر در پس امروز بود فردائے

"حق گو" اپنی اصل شکل میں

"حق گو" صاحب اپنی زبان سے چاہے جو کچھ کہیں مگر اقتباس مذکورہ بالا ان کے دلی جذبات کی صاف پردہ دری کر رہا ہے، اور ہر چند کہ انہوں نے ہوشیاری سے اپنا گناہ حدیثوں اور ان کے راویوں کے سر تھوپ دیا ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں، کہ جو الزامات انہوں نے قائم کیے ہیں ان میں سے اکثر کا کوئی نشان حدیث میں نہیں ہے، تو صاف کھل جاتا ہے کہ حقیقت میں تو ان کو اپنے عیسائی اور آریہ دوستوں کی ہمنوائی اور ان کی رضا جوئی مقصود تھی، لیکن ان باتوں کو اپنے نام سے لکھنے کی جرأت نہیں ہوئی، تو جھوٹ موٹ حدیثوں کے نام سے ان کو لکھ دیا۔

"حق گو" کو چیلنج

اگر "حق گو" صاحب کو ہماری بات سے انکار ہو تو ہم ان کو چیلنج دیتے ہیں کہ انہوں نے الزامات نمبر ۲، ۳، ۴، ۵ کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کا حوالہ دیا ہے، لہٰذا وہ کتب احادیث سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ان روایات کو نقل کر کے ان کے لفظی ترجمہ کے ساتھ بلا کسی تحریف کے شائع کر دیں۔

گستاخانہ اعتراضات کا دندان شکن جواب

میں تسلیم کرتا ہوں کہ حضرت جویریہ اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہما سے آپ نے نکاح کیا، اور یہ بیبیاں بے شبہ خوبصورت بھی تھیں لیکن روایات میں یہ تو کہیں بھی مذکور نہیں ہے کہ آپ نے معاذ اللہ ان کے حسن پر فریفتہ ہو کر نکاح کیا، بلکہ اس کے برخلاف روایات میں بصراحت مذکور ہے کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے اپنے باپ سے

خود ہی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہنے کی خواہش ظاہر کی۔[1] اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ یہ ہے، کہ وہ رئیس بنی نضیر حیی بن اخطب کی بیٹی تھیں جب وہ گرفتار ہو کر آئیں تو آنحضرت ﷺ کو خیال ہوا کہ اگر یہ کسی کی باندی اور کنیز بنادی گئیں، تو اس کو اپنی سخت بے عزتی سمجھیں گی، اس لئے ان کو نکاح کا پیغام دیا، انہوں نے منظور کر لیا۔

اس سلسلہ میں آپ نے عمرہ بنت جون کا نام بھی لیا ہے، حالانکہ ان کے قصہ میں بھی بصراحت مذکور ہے کہ ان کے باپ نے خود بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ آپ میری لڑکی سے نکاح کر لیجئے اور یہ بھی ظاہر کیا کہ لڑکی بھی یہ شرف حاصل کرنے کی آرزو مند ہے۔[2] اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ ''حق گو'' صاحب کے الزام نمبر۲ کی کوئی بنیاد حدیثوں میں نہیں ہے، بلکہ اس کو انہوں نے محض اپنی جہالت کی بنا پر یا اپنے غیر مسلم دوستوں کی تقلید وحمایت میں لکھ دیا ہے۔

یہی حال الزام نمبر۳ کا بھی ہے، حدیثوں میں صرف اتنا مذکور ہے کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا جب بوڑھی ہوئیں، تو انہوں نے خود آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ آپ میرے لئے باری مقرر نہ کیجئے میں اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کرتی ہوں، حضور ﷺ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی۔[3] صحیح روایتوں میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے، پھر یہ قصہ بھی تنہا حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ پیش آیا، پس معلوم نہیں کہ ''حق گو'' صاحب کو کیا عناد ہے کہ انہوں نے ایک بے بنیاد الزام تراش لیا اور اس کو ایسے الفاظ میں لکھا کہ جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ ایسا واقعہ اکثر ہوتا رہتا تھا۔ (توبہ توبہ)

اور یہی کیفیت الزم نمبر۴ کی بھی ہے، کتب حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

---

[1] اصابہ حالات جویریہ اور سیرۃ النبی شبلی

[2] فتح الباری: ۲۸۷/۵ [3] مسلم: ۴۷۳/۱، بخاری: ۷۸۵/۲

اس مضمون کی کوئی روایت ہی نہیں ہے، حضرت جابر ؓ وغیرہ سے البتہ ایک روایت ہے، جس میں آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کے لوگوں کو یہ تعلیم دی ہے، کہ جب تم کسی عورت کو دیکھو اور تمہارے دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہو جائے تو اپنی بی بی کے پاس چلے جایا کرو، اس وسوسہ کا علاج ہو جائے گا، لیکن اس روایت میں کسی عورت کے حسن کو دیکھ کر آنحضرت ﷺ کا بے قرار ہو جانا معاذ اللہ مذکور نہیں ہے، اگر ”حق گو“ صاحب نے کسی عناد کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی مقدس شان میں یہ گستاخی نہیں کی ہے، تو کیا وہ کسی روایت میں مذکورہ بالا بے ہودہ الفاظ دکھا سکتے ہیں۔

اور یہی نوعیت پانچویں الزام کی ہے، ”حق گو“ صاحب نے اس الزام میں حضرت زینب اور حفصہ و ماریہ ؓ کے واقعات کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ حدیثوں سے یہ واقعات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتے، حضرت زینب ؓ کا سرے سے کوئی ایسا واقعہ مذکور ہی نہیں ہے، اور حفصہ اور ماریہ ؓ کا جو قصہ دشمنان اسلام آنحضرت ﷺ کی اہانت شان کے لئے ذکر کیا کرتے ہیں اس کا بھی صحیح روایات میں کوئی نشان موجود نہیں، چنانچہ صحاح ستہ جو حدیث کے صحیح و مستند ترین مجموعے ہیں، ان میں حضرت حفصہ ؓ کی باری میں حضرت ماریہ ؓ کے پاس جانے کا کسی جگہ اشارہ تک نہیں ہے، اور طبری وغیرہ کی بعض روایات میں جو قصہ مذکور ہے، اس کی نسبت عینی شرح بخاری (جلد ۹ صفحہ ۵۲۸)، نووی شرح مسلم (جلد ۱ صفحہ ۴۷۹) میں مصرح ہے، کہ ”ماریہ قبطیہ ؓ کا یہ قصہ کسی صحیح طریقہ سے وارد نہیں ہوا“ اور یہی بات قاضی عیاض نے بھی شرح مسلم میں کہی ہے۔[1] اور زمانہ حال کے نامور مورخ شبلی نعمانی کی بھی یہی تحقیق ہے، پس ایسی ناقابل اعتبار روایات کو دکھا کر جن کو حدیثوں کے ماننے والے خود کمزور اور بے اصل بتا رہے ہیں، سارے ذخیرہ احادیث کی نسبت بدگمانی پھیلانا کہاں کی دیانت ہے۔

---

[1] نووی: ۴۷۹/۱

اس مختصر بیان سے آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا، کہ ’’حق گو‘‘ صاحب کے چار الزامات تو بالکل بے بنیاد اور محض اتہام ہیں، اب رہی ان کی پہلی بات تو وہ بلا شبہہ حدیث سے ثابت ہے لیکن اس کو شہوت پرستی کہنا انتہائی نادانی اور پرلے درجہ کے بے انصافی ہے، افسوس ہے کہ ’’حق گو‘‘ نے الفاظ تو ضرور رٹ لئے ہیں، لیکن ان کے معانی سے قطعاً بے خبر ہیں، حیرت ہے کہ ان کو آج تک یہ خبر ہی نہیں کہ جائز محل میں جائز طریق پر طبعی خواہش کا پورا کرنا شہوت پرستی نہیں کہلاتا ہے، ورنہ پھر ’’حق گو‘‘ صاحب کے قول پر تو کوئی انسان شہوت پرستی سے خالی نہیں ہوسکتا۔

قرآن کریم نے بی بی اور کنیز سے حاجت برآری کی صریح اجازت دے کر یہ فرمایا ہے کہ بی بیوں اور کنیزں کے ساتھ خواہش پوری کرنے میں کوئی ملامت والزام نہیں ہے، لیکن ’’حق گو‘‘ صاحب کے نزدیک اس صورت میں بھی الزام ہے، کہیے ’’حق گو‘‘ صاحب کیا آپ حدیثوں کا انکار کر کے قرآن میں بھی اصلاح دینے لگے، کیا قرآن قریم کی ان آیتوں کے اطلاق وعموم سے یہ مستفد نہیں ہوتا کہ اگر متعدد بیبیاں ہوں، اور ان سب کے پاس ایک ہی دن میں ہوآئے تو بھی ملامت نہیں ہے؟

پھر ’’حق گو‘‘ صاحب نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ قرآن نے ہر مومن کے لئے چار چار عورتوں سے نکاح کرنے کی صراحۃً اجازت دی ہے اور ہر عورت کے لئے علیحدہ علیحدہ باری مقرر کرنے کا کوئی حکم بیان نہیں کیا ہے، پس اگر کوئی شخص چار عورتوں سے نکاح کر کے سب کے پاس ایک ہی شب میں چلا جائے تو وہ قرآنی حکم کی رو سے شہوت پرست کہلائے گا یا نہیں، اگر ’’حق گو‘‘ صاحب کہیں کہ وہ شہوت پرست ہے، تو مہربانی کر کے وہ مجھے بتائیں کہ یہ حکم قرآن کی کس آیت میں مذکور ہے، اور جب کہ قرآن نے باری کا مسئلہ بیان نہیں کیا تو شخص مذکور شہوت پرست کیوں کہا جائے گا، اور اگر ’’حق گو‘‘ صاحب کہیں کہ وہ شہوت پرست نہیں ہے، تو بتائیں کہ الزام نمبر ۱۰ میں جس حدیث کا حوالہ انہوں نے دیا ہے، اس کو پھر کیوں

مطعون کرتے ہیں۔

اسی طرح تاریخوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے نو بیبیاں تھیں، اور اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو سورۂ احزاب میں یہ اجازت دی ہے کہ:

”اپنی ان بیبیوں میں سے جن کو چاہئے اپنے نزدیک کیجئے، اور جن کو چاہئے دور رکھئے۔“

پس اگر آنحضرت ﷺ نے اپنی جملہ ازواج مطہرات کو کسی مصلحت سے ایک ہی رات میں اپنے نزدیک کرلیا تو ”حق گو“ صاحب بتائیں کہ اس آیت قرآنی سے اس فعل کا جواز ثابت ہوتا ہے، یا نہیں، اگر کہئے کہ نہیں تو میں کہوں گا کہ کیوں کیا قرآن نے کسی آیت میں آنحضرت ﷺ یا عامہ مؤمنین کے لئے باری مقرر کرنا ضرور قرار دیا ہے، اور ایک دن یا رات میں سب بیبیوں سے صحبت کرنے کو ناجائز یا ”شہوت پرستی“ کا مرادف بتایا ہے، یا قرآن نے اسی مذکورہ بالا آیت میں آنحضرت ﷺ کو یہ حکم دیا ہے کہ اپنی ازواج ﷺ کو باری باری سے علیحدہ علیحدہ راتوں میں اپنے نزدیک کیجئے؟ سو اگر ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت نہیں ہے، تو یقیناً آیت بالا سے فعل مذکور کا جواز ثابت ہوگا اور اگر کہئے کہ ہاں فعل مذکور کا جواز آیت سے نکلتا ہے تو پھر آپ نے حدیث ہی کو نشانہ طعن کیوں بنایا، اپنے پیشتر غیر مسلموں کی طرح آیت ہی کی نسبت زہر افشانی کیوں نہیں کی؟

نوٹ: واضح ہو کہ یہ تقریریں تمام تر الزامی ہیں، اور اگر قائلین حدیث کو مسئلہ قسم کی وجہ سے اشکال پیش آئے، تو اس کا حل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ پر باری مقرر کرنا واجب نہ تھا، اور اگر واجب بھی ہو تو ایک دورہ کے ختم ہونے اور دوسرے کے شروع ہونے سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا ہوگا، جس کی باری اس دن تھی اس کی اجازت سے ایسا ہوا تھا۔[1]

---

[1] نووی، فتح الباری

اس عنوان کے ماتحت "حق گو" صاحب کی دوسری زہر افشانی

اس کے بعد "حق گو" صاحب لکھتے ہیں:

> "اسی طرح آپ کے مغازی میں کوئی بات ایسی نہیں ہے، جس کا الزام حدیثوں نے اور اس سے زیادہ واقدی نے آپ پر نہ لگایا ہو یعنی بوڑھے ناتواں کو قتل کرانا، بچوں والی ماں کو قتل کرانا، جنگ خیبر میں لوگوں کو آگ سے عذاب دینا کہ خزانہ کا پتہ بتائیں، کھیتوں اور مکانوں کو برباد کرنا لوگوں کو تیغ بیدریغ کرانا، ان کی عورتوں کو بلا نکاح لوگوں کے حوالے کر دینا۔"

"حق گو" صاحب کی جرأت قابل داد ہے، کہ حدیثوں کو مطعون کرنے کے لئے اتنی ساری باتیں لکھ ڈالیں، لیکن حوالہ ایک کا بھی نہ دیا، حالانکہ آپ کو چاہئے تھا کہ جس طرح یہ بے سروپا باتیں آپ نے دل سے گھڑی ہیں، ان کے لئے غلط حوالے بھی تراش لیتے "حق گو" صاحب اس افتراء پردازی و بہتان طرازی سے آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے، جب کہ خود صحاح میں ذیل کی حدیثیں آپ کی تکذیب کے لئے موجود ہیں۔

"حق گو" کے افتراؤں کا جواب بروئے احادیث

❶ ابوداؤد (جلد۲ صفحہ۲۵۹) میں بروایت انس رضی اللہ عنہ ارشاد نبوی ﷺ ہے، "ولا تقتلوا شيخًا فانيًا ولا طفلاً ولا صغيرًا ولا امرأةً" (یعنی) کسی ناتواں بوڑھے کو قتل نہ کرنا، نہ کسی بچے کو، نہ کسی کم عمر والے نابالغ لڑکے کو، نہ کسی عورت کو، اور بخاری (جلد۲ صفحہ۴۲۳) میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے

عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع کیا، اور ابوداؤد و دیگر کتب صحاح میں ہے، کہ کسی لڑائی میں آنحضرت ﷺ نے کسی عورت کو مقتول پایا، تو بڑی ناگواری ظاہر فرمائی۔

ان حدیثوں سے ’’حق گو‘‘ صاحب کی پہلی اور دوسری بات کے بے سر و پا اور افتراء ہونا آفتاب کی طرح روشن ہے۔

❷ حدیثوں میں کوئی ایسا واقعہ مذکور نہیں ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے جنگ خیبر میں خزانہ چھپانے والوں کو آگ سے عذاب دیا، بلکہ اس کے برخلاف ابوداؤد میں مذکور ہے، کہ حی بن اخطب کے بھائی سعیہ سے آنحضرت ﷺ نے خزانہ کی نسبت دریافت کیا، اور اس نے چھپایا، لیکن اس کا کچھ ذکر نہیں ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے اس کو کوئی معمولی ہی سزا دی، اور بعض لوگ جو یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ کنانہ یہودی اسی جرم میں مارا گیا، تو یہ بالکل غلط ہے، کنانہ محمود بن مسلمہ کے قصاص میں مارا گیا ہے، جیسا کہ تاریخ طبری میں مصرح ہے، اور یوں بھی یہ بات لغو معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ اگر کنانہ کا یہی جرم تھا، کہ اس نے خزانہ چھپایا تھا، تو یہ جرم سعیہ نے بھی کیا تھا، جیسا کہ ابوداؤد میں مصرح ہے، لیکن اس کی سزا یابی یا قتل کا ذکر کوئی نہیں کرتا، بہر حال حدیثوں میں اس الزام کا کوئی نشان نہیں۔

❸ کھیتوں کے برباد کرنے کا کوئی واقعہ حدیثوں میں مذکور نہیں ہے، ہاں غزوہ بنی نضیر میں لینہ (ایک قسم کی کھجور) کے کچھ درخت کٹوانے اور ان کے جلوانے کا ذکر ضرور ہے، لیکن یہ تنہا حدیثوں میں نہیں، بلکہ قرآن مجید میں بھی مذکور ہے، اور خدا تعالیٰ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے بجائے اظہار ناراضی کے اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا ہے، کہ یہ سب ہماری اجازت و خوشی سے ہوا ہے، سورہ حشر میں ارشاد ہوتا ہے کہ ’’وَمَا قطعتم مِنْ لِيْنَةٍ اوْتركتموهَا قائمةً عَلٰى اصُولها فباذن الله وليخزي الفاسقين‘‘ (یعنی) تم نے لینہ کے جو درخت کاٹے یا ان کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، تو یہ سب اللہ کے حکم سے تھا، اور تا کہ خدا فاسقوں کو ذلیل و رسوا

کرے۔

حضور ﷺ کا عفو عام اور کرم بے پایاں

● لوگوں کو تہ تیغ بے دریغ کرانا بھی حدیثوں سے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ وہ آپ کے عفو عام اور کرم بے پایاں کے واقعات سے بھری ہوئی ہیں، غزوۂ بدر، غزوہ بنی مصطلق، فتح مکہ اور ہوازن کے اسیروں کے حالات مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر کتب احادیث میں پڑھئے، اور میری تصدیق کیجئے۔

توریت کی شہادت

اور اگر کسی شخص کو یہود بنو قریظہ کے واقعات سے دل میں خلجان پیدا ہو، تو وہ توریت کتاب استثناء کی یہ آیتیں پڑھے۔

> ”اور جب تو کسی شہر کے پاس ان سے لڑنے کے لئے آپہنچے، تو پہلے اس سے صلح کا پیغام کر، تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور، اور دروازہ تیرے لئے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے، تیری خراج گزار ہوگی، اور تیری خدمت کرے گی، اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو اس کا محاصرہ کر، اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دے، تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکوں اور مویشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کا سارا لوٹ اپنے لئے لے۔“[1]

اس سے اس کو یقین ہو جائے گا کہ یہود بنی قریظہ کو جو سزا دی گئی، وہ بعینہ ان کی شریعت کے مطابق تھی، چنانچہ اسی وجہ سے سردار بنی قریظہ نے اپنے قتل سے پہلے یہ کہا کہ۔

---

[1] کتاب استثناء ب ۲۰

"یہ جو کچھ ہو رہا ہے، یہی حکم الٰہی تھا، اور ایسا ہی لکھا ہوا تھا۔"[1]

❺ کافروں کی اسیر عورتوں کو کنیز بنانے کا الزام بھی نہایت بے ہودہ الزام ہے، تاریخ شاہد ہے کہ یہ دستور نہایت قدیم ہے، اور مہذب سے مہذب حکومتوں میں اس کا رواج ہمیشہ رہا ہے، اور اگلی شریعتوں نے بھی اس کو جائز رکھا ہے، چنانچہ توریت کی کتاب استثناء کے باب ۲۱ میں اس کی اجازت بصراحت مذکور ہے، لہٰذا اس مذہب اسلام کو نشانۂ ملامت بنانا (جیسا کہ غیر مسلموں نے کیا ہے) سخت بے انصافی و بد دیانتی ہے، اور اس سے زیادہ بے انصافی حدیثوں کو مطعون کرنا ہے (جیسا کہ "حق گو" نے کیا ہے) اس لئے کہ قرآن کریم نے متعدد مقامات میں "اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ" کے عنوان سے کنیزوں سے نفع اٹھانے کو جائز و مباح قرار دیا ہے، اور سورۂ احزاب میں اس کے ساتھ "مِمَّا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ" کے الفاظ بھی ہیں، جو خاص ان چیزوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں، جو جنگ میں غنیمت کے طور پر حاصل ہوتی ہیں۔

عرینین کا واقعہ

اس کے بعد "حق گو" صاحب نے عرینین کا واقعہ صحیحین سے نقل کر کے لکھا ہے:

> ① "ڈاکٹر زویمر ایک متعصب امریکن مشنری نے اس روایت کو ہو بہو فوٹو سے چھاپا ہے ② ایک ایسا شخص جو جانور کے وحشیانہ ذبح اور تیر باراں کرنے پر سختی سے منع کرتا ہے، اور اس وقت جب کہ آپ کے چچا حمزہ کا میدان احد میں مثلہ کیا گیا، بدلہ نہیں لیتے، وہ ایک انسان کو اس بے دردی سے قتل کرائے ناممکن ہے ③ اس روایت کے متن اور اسناد میں اختلاف و تناقض ہے ④ یہ روایت صرف حضرت انس سے مروی

---

[1] طبری

ہے، دوسرے کسی صحابی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ⑤ اس روایت میں پیشاب پینے کا حکم دینا بھی مذکور ہے، تو کیا حضور ﷺ ناپاک اور حرام چیزوں کے استعمال کا بھی حکم دیتے تھے۔“

امر اوّل کا جواب

”حق گو“ صاحب یورپ و امریکہ سے ایسے مرعوب ہیں، کہ جس بات کو کسی یورپین یا امریکہ نے معیوب کہہ دیا، وہ اس کو معیوب اور قابل نفرت سمجھنے لگتے ہیں، لیکن یہ مرعوبیت یا تقلید جامد ان ہی کو مبارک ہو، مسلمانوں کے نزدیک حسن و قبح کا واحد معیار خدائے تعالیٰ و رسول ﷺ کا استحسان و استہجان ہے، زویمر نے اگر اس روایت کو فوٹو سے چھاپا تو یہ اس کی بے عقلی و بددیانتی ہے، اور اس کو ”متعصب امریکن مشنری“ جانتے ہوئے آپ کا اس کی اس حرکت سے متاثر ہونا اور اس حدیث کا انکار کر دینا بھی سخت نافہمی ہے، آپ کو عقل سے کام لینا چاہئے تھا، کہ متعصب عیسائی قرآن کریم، رسالت آنحضرت ﷺ اور اسلام میں سے کس چیز پر حرف گیری نہیں کرتے، اور ان میں سے کس کا مضحکہ نہیں اڑاتے، تو کیا آپ ان چیزوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے؟

عیسائی اپنے گھر کی خبر لیں

آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ زویمر کو اس روایت پر حرف گیری کا کیا حق حاصل تھا، جب کہ عہد نامہ قدیم کی متعدد کتابوں میں مرتد کے قتل کا صریح حکم موجود ہے[1] اور کتاب خروج ب۳۲ میں بنی اسرائیل کے ارتداد اور گوسالہ پرستی کے قصہ میں مذکور ہے:

”تب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہوئے، اور اس نے انہیں کہا، کہ

---

[1] کتاب استثناء ب۱۷ اور ب۱۳ اور کتاب احبار ب۲۴

> خداوند، اسرائیل کے خدا نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے اور ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک تمام لشکر گاہ میں گزرتے پھرو، اور ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو اور ہر ایک اپنے دوست اور ہر ایک آدمی اپنے قریب کو قتل کرے، اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے مطابق کیا، چنانچہ اس دن لوگوں میں قریب تین ہزار مرد مارے پڑے، اور موسیٰ نے کہا کہ آج خداوند کے لئے اپنے تئیں مخصوص کرو ہر ایک مرد اپنے بیٹے اور اپنے بھائی پر حملہ کرے، تاکہ وہ آج تمہیں برکت دے۔“

زوبیر کو انصاف کی ہوا لگی ہوتی تو سات آٹھ مرتدین کے بجائے ان تین ہزار آدمیوں کے ”نہایت بے دردی“ سے صرف ایک دن میں قتل کیے جانے کا فوٹو کھینچ کر بتاتا کہ یہ اس عہد قدیم کی تعلیم ہے جس کو جاری کرنے کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں آئے تھے، آخر یہ کیا کہ دوسرے کی آنکھ کا تنکا تو نظر آتا ہے، لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا؟

امر ثانی پر گفتگو

”حق گو“ صاحب! ہوش میں آیئے، حدیثوں کا انکار کرنے کے بعد آپ کے لئے ممکن نہیں، کہ آنحضرت ﷺ کا جانوروں کے وحشیانہ ذبح اور تیر باراں کرنے سے منع کرنا، اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مثلہ کا بدلہ نہ لینا بیان کرسکیں یہ سب باتیں تو حدیث ہی کی بدولت معلوم ہوسکتی ہیں۔ اور اس کے آپ منکر ہیں۔ لہذا یا تو انکارِ حدیث سے توبہ کیجئے، یا ان باتوں کا ذکر چھوڑیئے، کہئے اب تو آپ کے لئے حدیث حلق کی ہڈی ثابت ہوئی ہوگی، کہ اگلتے بنے نہ نگلتے بنے، بہرحال خوب سوچ کر جواب دیجئے، اور اس کے بعد اپنی دوسری بدحواسی ملاحظہ کیجئے، کہ آپ عرنیین کے

قتل کو "بے دردانہ انتقام" سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ آپ نے خود ہی عرنیین کے واقعہ میں نقل کیا ہے کہ:

"① وہ مرتد ہو گئے (یعنی مسلمان ہونے کے بعد دین سے پھر گئے) اور ② آنحضرت ﷺ کے چرواہے کو مار ڈالا ③ اور اونٹوں کو بھی ہانک لے گئے۔"

یعنی انہوں نے تین بڑے جرم کیے تھے، ارتداد اور قتل ناحق، اور ڈاکہ زنی، ان میں سے تنہا ارتداد اتنا بڑا جرم ہے، جس کا اور کوئی جرم مقابلہ نہیں کر سکتا، اور ہر شریعت میں اس کی سزا قتل قرار دی گئی ہے، تورات کی تصریحات پہلے آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔

سزائے ارتداد اور قرآن

توریت کے اسی واقعہ کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْا اِلٰی بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ فَتَابَ عَلَیْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝﴾

ترجمہ: "(یعنی) اور یاد کرو جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! تم نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا، اپنے خالق کی بارگاہ میں توبہ کرو، کہ اپنے لوگوں کو قتل کرو، یہ تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک اچھا ہے، وہ بہت توجہ کرنے والا مہربان خدا ہے۔"

دیکھئے قرآن نے بھی ارتداد کی سزا قتل ہی بتائی ہے، لیکن چونکہ آپ جیسے تعلیم یافتہ لوگوں کے نزدیک ایمان کی کوئی قیمت نہیں ہے، اور کفر و شرک کوئی جرم نہیں ہے،

(حالانکہ اگر آپ حقیقۃً قرآن کے متبع ہوتے، تو شرک سے بڑھ کر آپ کے نزدیک کوئی جرم نہ ہوتا، کہ خدا فرماتا ہے "اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ" یعنی شرک بے شبہہ بہت بڑا ظلم ہے) اس لئے اس جرم کو کوئی اہمیت بھی نہ دیجئے، تو باقی دو جرم ہی کیا کم ہیں، قتل ناحق کے بدلے قتل، اسی طرح راہزنی کی سزا میں راہزن کی گردن اڑا دینا سولی دینا، اور الٹے ہاتھ پاؤں کاٹنا قرآن کا صریح حتمی حکم ہے، قتل ناحق کے باب میں "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی" وغیرہ کی تلاوت کیجئے۔

راہزنوں کی سزا

اور راہزنوں کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا﴾

کیا قرآن کے اس حکم کے بعد بھی عرینین کے قتل کو بے دردانہ انتقام کہیں گے؟ کیا قرآن نے ان مجرموں کے ساتھ ہمدردی کی تعلیم دی ہے؟ اچھا قرآن نہیں، دنیا میں کسی قانون ملکی نے ایسے مجرموں کے ساتھ ہمدردی کو جائز رکھا ہے، کیا آپ نے کسی حکومت کی تاریخ میں پڑھا ہے، کہ اس نے خونیوں، حکومت کے باغیوں اور ڈاکوؤں کو جاگیریں بخشی ہیں اور منصب دیئے ہوں؟ اگر نہیں تو پھر یہ حدیث آپ کی آنکھوں میں کیوں کھٹک رہی ہے۔

عرینین کی سفاکیاں

اس کے بعد سنئے کہ عرینین نے ایک ہی نہیں بلکہ کئی چرواہوں کو قتل کیا تھا[1] اور

---

[1] مسلم: ۲/۵۷، نسائی: ۲/۱۶۷

صحیح ابن حبان میں "ثم مالوا علی الرعاۃ فقتلوھم" (یعنی عرینین چرواہوں کی طرف جھکے، اور ان کو مار ڈالا) اور انہوں نے چرواہوں کی آنکھوں میں گرم سلائیاں بھی پھیریں تھیں، مسلم (جلد۲ صفحہ ۵۸)، ترمذی (صفحہ ۳۶)، نسائی (جلد۲ صفحہ ۱۶۸) میں حضرت انس ؓ کا بیان ہے، "انَّمَا سَمَلَ النبیُّ صلَّی اللّٰہ علیہ وسلَّم اعینھُمْ لاَنَّھُمْ سَمَلُوا اعین الرعاۃ." (یعنی) آنحضرت ﷺ نے عرنیوں کی آنکھوں میں سلائی اس لئے پھروائی کہ انہوں نے چرواہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیریں تھیں۔ اور سیر کی کتابوں میں یہ تصریح بھی ہے کہ انہوں نے چرواہوں کو مارا تھا، بعینہٖ ایسی ہی سزا ان کو دی گئی تا کہ پھر ان حرکات ناشائستہ کی جرأت کوئی نہ کرے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد کسی کو ایسی سزا آپ نے نہ دی۔

مثلہ کرنے سے حضور ﷺ کی ممانعت

بلکہ اس کے بعد خطبہ میں آنحضرت ﷺ نے مثلہ کی برائیاں بیان کیں، اور سختی سے اس کو ممنوع قرار دیا، جیسا کہ خود حضرت انس ؓ نے بیان کیا ہے۔[1]

غیر موذی بے زبان جانوروں پر خونی اور ڈاکو عرنیوں کو قیاس کرنا بھی "حق گو" صاحب ہی کی عقل جائز رکھتی ہے، اسی طرح حضرت حمزہ ؓ کے مثلہ پر بھی غریبوں کے ظلم وستم کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ اولاً تو مرتد اور اصلی کافر کے احکام جدا جدا ہیں، ثانیاً آنحضرت ﷺ اس ظلم وستم کا انتقام نہ لیتے تھے، جس کا تعلق براہ راست آپ سے ہو، حضرت حمزہ ؓ کی مظلومیت اسی قسم سے تھی، لیکن دوسرے مسلمانوں پر جو ظلم وستم ہوتا تھا، اس کی واجبی سزا ظالموں کو ضرور دیتے تھے، اس لئے کہ اگر ایسا نہ کرتے، تو مظلومین کی دادرسی نہ ہوتی، اور نہ ظالموں کی عبرت ناک سزا دیکھ کر دوسرے لوگ ظلم سے باز رہتے، عرینین کا ظلم اسی قبیل سے تھا، اس لئے ان کو

---

[1] ابوداؤد، نسائی

سزا دینا ضروری اور واجب تھا، آدمی اپنے حقوق چھوڑ دے، اور معاف کردے، لیکن دوسروں کے حقوق کو معاف کرنے کا اس کو حق نہیں ہے۔

امر ثالث پر بحث

''حق گو'' صاحب نے اس روایت کے متن واسناد کے اختلاف کا جو ذکر کیا ہے، وہ ان کی ناواقفیت کی بین دلیل ہے، متن میں انہوں نے یہ اختلاف دکھایا ہے کہ کہیں ان کو پیاسا تڑپا کر مارنا مذکور ہے، اور کہیں آنکھوں میں کانٹے چبھونے کا ذکر ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کو اختلاف بیانی کہنا ناسمجھی ہے، بات یہ ہے کہ عرنیین کے ساتھ یہ دونوں معاملے ہوئے تھے، مگر راویوں نے جب قصہ کو مختصر کرکے بیان کیا تو کسی نے یہ جزء حذف کردیا، اور کسی نے وہ جزء حذف کردیا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جن روایتوں میں تفصیلی بیان ہے، ان میں دونوں باتیں مذکور ہیں[1] اور اسناد میں یہ اختلاف دکھایا ہے کہ:

ایک جگہ ہے ''محمد بن الصلت، حدثنا الولید حدثنا الاوزاعی عن یحییٰ عن ابی قلابة عن انس'' دوسری جگہ ہے ''موسی بن اسمٰعیل عن وھب عن ایوب عن ابی قلابة'' لیکن یہ بھی کوئی اختلاف نہیں ہے، قصہ یوں ہے کہ ابو قلابہ کے دو شاگرد ہیں، ایک ایوب دوسرے یحییٰ اور ان دونوں نے ابو قلابہ سے اس حدیث کو سنا ہے، پھر ایوب سے وہیب نے اور ان سے موسیٰ بن اسمٰعیل نے اس حدیث کو سنا ہے، اور یحییٰ سے اوزاعی نے، اور اوزاعی سے ولید نے اور ولید سے محمد بن الصلت نے سنا، پھر بخاری موسیٰ اور محمد بن الصلت دونوں کے شاگرد ہیں، اور ان دونوں سے انہوں نے اس حدیث کو سنا ہے، اس لئے کہیں موسیٰ کے واسطے سے ان کی بیان کی ہوئی روایت ذکر کرتے ہیں، اور کہیں محمد بن الصلت کے واسطے سے اس روایت کو ذکر کرتے ہیں، مجھے افسوس ہے کہ فن کی ایسی معمولی اور

---

[1] نسائی: ۲/۱۶۶، ۱۶۷

کثیر الوقوع بات بھی ''حق گو'' صاحب کو سمجھانی پڑتی ہے ~

ذوق بازیچۂ طفلان ہے سراسر یہ زمین
ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

''حق گو'' صاحب آپ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ پروفیسر براؤن کی کوئی تحقیق آپ سے ان کے دو شاگرد نکلسن اور اسمتھ بیان کریں اور آپ اس تحقیق کو نقل کرنے کے وقت کبھی یوں کہیں کہ مجھ سے اس کو نکلسن نے بیان کیا، اور کبھی کہیں کہ مجھ سے اسمتھ نے بیان کیا، تو اس کو اختلاف بیانی نہ کہیں گے، بلکہ کہا جائے گا، کہ دونوں بیان صحیح ہیں۔

امر رابع پر گرفت

یہ بھی ''حق گو'' صاحب کی لاعلمی اور انتہائی ناواقفیت ہے، اس واقعہ کو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے[1] اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے[2] اور حضرت سلمۃ بن الاکوع رضی اللہ عنہ نے[3] بھی روایت کیا ہے۔

امر خامس پر نظر

حدیث مذکور پر ''حق گو'' صاحب کا پانچواں اعتراض بھی قلت تدبر کا نتیجہ ہے، پیشاب بے شک ناپاک ہے، اور اس کا استعمال بھی بے شبہ حرام ہے لیکن آپ نے غور نہیں کیا، کہ عرینین کو استسقاء کی بیماری ہو گئی تھی، اطباء کی قلت، دواخانوں کے فقدان اور بے زری کی وجہ سے کوئی دوسرا علاج ممکن نہ تھا، اور عرب لوگ اس مرض کا علاج اونٹ کا پیشاب پلا کر کیا کرتے تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جان بچانے کے لئے اونٹوں کا پیشاب پینے کی اجازت دی، جیسا کہ قرآن کریم نے مردار اور دم مسفوح وغیرہ کو حرام قطعی بتاتے ہوئے اس شخص کے لئے بقدر سد رمق

---

[1] نسائی: ۲/۱۶۷

[2] نسائی: ۲/۱۶۷، ابوداؤد: ۲/۱۴۰

[3] زرقانی: ۲/۱۷۶

استعمال کرنے کی اجازت دی، جس کی بھوک پیاس سے جان جا رہی ہو "فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ" کیوں "حق گو" صاحب! کیا یہاں بھی آپ یہ سوال کر بیٹھیں گے کہ کیا خدا مردار کھانے کی اجازت دیتا ہے؟ تو پھر اسی عرینین کے واقعہ کو بھی قیاس کر لیجئے۔

"حق گو" صاحب نے ساتواں عنوان یوں قائم کیا ہے:

آنحضرت ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ۹ سال کی عمر میں نکاح کرتے ہیں

اور اس کے ماتحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح اور رخصتی کا واقعہ نقل کر کے لکھتے ہیں:

> "نکاح کے لئے بلوغ کی شرط نہ صرف قرآن کے صاف صریح الفاظ "حتی اذا بلغوا النکاح" سے ثابت بلکہ کوئی متمدن قانون نہیں ہے، جو نکاح کے لئے بلوغ کو ضروری نہ کہتا ہو، نکاح سے میری مراد خلوت صحیحہ اور جماع ہے، اسلام میں نکاح ہی نہیں ہوتا ہے جب تک کہ عورت بالغ نہ ہو، کیونکہ ایجاب وقبول کے لئے شرط بلوغ ہے، عرب میں ہر زمانہ میں بلوغ کی عمر زیادہ رہی ہے۔"

"حق گو" صاحب کا یہ فرمانا تو ایک حد تک بجا ہے کہ خلوت و جماع کے لئے بلوغ شرط ہے، لیکن اس سے بہتر عنوان یہ تھا کہ، اہلیت وصلاحیت شرط ہے۔

جواز نکاح کے لئے بلوغ شرط نہیں

باقی انکا یہ دعویٰ کہ نکاح کے لئے بلوغ کی شرط قرآن کے الفاظ "حتی اذا بلغوا النکاح" سے ثابت ہے، بالکل غلط ہے "حق گو" صاحب کو معلوم ہونا

چاہئے، کہ جس آیت کے یہ الفاظ ہیں، اس میں نکاح اور اس کے شرائط کا بیان نہیں ہے، بلکہ مال یتیم کی نگرانی وحفاظت کا حکم اس میں مذکور ہے، اور اس کا حاصل یہ ہے کہ "جب یتیم بچے نکاح کو پہنچ جائیں، اور تم کو محسوس ہو کہ اب وہ اپنے مال کی حفاظت کریں گے، تو ان کو ان کا مال دے دو۔" قرآن کے الفاظ یہ ہیں "حتّٰی اذا بَلغُوا النکاح فَاِن آنستم مِنھم رُشدًا فادفعُوا الیھمْ اموالھم" بتایئے کہ ان میں کس لفظ سے ثابت ہوتا ہے، کہ نکاح کے لئے بلوغ شرط ہے اور اس کا یہاں کیا محل ہے؟ اگر کہئے کہ آیت میں اگرچہ نکاح کا حکم مذکور نہیں، تاہم "اِذَا بَلغُوا النِکاح" سے یہ مستفاد ہوتا ہے، کہ انسان ابتدائے پیدائش سے ہی جماع کے قابل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے کوئی خاص وقت ہوتا ہے اس لئے فرمایا کہ "جب یتیم بچے نکاح کو یعنی اس کے وقت کو پہنچ جائیں" تو میں کہوں گا کہ بے شک یہ ضرور مستفاد ہوتا ہے لیکن اس خاص وقت کا بیان قرآن میں نہیں ہے، یعنی اس وقت کی قرآن نے تعیین نہیں کی کہ وہ حیض کی ابتداء، یا آغاز احتلام کا وقت ہے، یا عمر انسانی کا کوئی معین سال، مثلاً پندرہواں یا اٹھارہواں سال، یا وہ وقت جب کہ مرد وعورت میں جماع کی قوت پیدا ہو جائے، چاہے حیض یا احتلام شروع ہو یا نہ ہو، اور عمر کے پندرہ یا اٹھارہ سال پورے ہوئے ہوں یا نہ ہوں، پس جب قرآن میں یہ تعیین نہیں ہے تو آپ کا مدعا کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتا، اور نہ آیت آپ کے مفید مطلب ہو سکتی ہے۔

یہ آیت "حق گو" کے مدعا کے خلاف ہے

بلکہ اگر آپ غور کریں گے تو یہ آیت آپ کے مطلب کے لئے بہت مضر ثابت ہوگی، وہ اس طرح کہ اگر جماع کے لئے اللہ کے علم میں کوئی خاص سال عمر کا متعین ہوتا، اور اس سے کم عمر میں وطی حرام ہوتی تو صاف صاف اس سال معین کا نام لینے میں کیا قباحت تھی؟ خصوصاً جب کہ قرآن کے سوا (بزعم منکر حدیث) اور کوئی ذریعہ

بیان بھی موجود نہ تھا، پس دو حال سے خالی نہیں، یا تو اس وقت خاص کی تعیین اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے حوالے کی ہوگی، اور لوگوں کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل سے اس خاص وقت کی تعیین معلوم کریں، یا پھر اس کو زوجین اور ان کے اولیاء کی رائے پر چھوڑا ہوگا کہ زوجین خود یا ان کے سرپرست عرف و عادت اور جسمانی حالت وغیرہ کے ذریعہ تعیین کریں کہ ان میں جماع کی قوت و صلاحیت پیدا ہوگئی ہے یا نہیں، بہرحال کسی شق میں جماع کے لئے کسی خاص عمر کی تحدید قرآن سے ثابت نہ ہوئی، نہ بلوغ بمعنی حیض و احتلام، یہ عمر خاص کا شرط نکاح بمعنی جماع ہونا اس سے ثابت ہوگا، اور اگر "حق نو" صاحب پہلی شق اختیار کریں گے، تو قرآن و حدیث کا حجت ہونا بھی ان کو لازماً ماننا پڑے گا، اسی طرح اپنے اس فقرہ میں بھی کہ:

"اسلام میں نکاح ہی نہیں ہوتا جب تک عورت بالغ نہ ہو"

انہوں نے غلط بحث کر دیا، اس لئے کہ اگر یہاں بھی نکاح سے مراد خلوت ہے تو یہ وہی پہلی بات ہوئی، لہٰذا تکرار بے فائدہ ہے، نیز ان کی یہ عبارت بیان کرنا کہ

"ایجاب و قبول کے لئے بلوغ شرط ہے"

بالکل بے تکی بات ہے، ہر آدمی جانتا ہے کہ ایجاب و قبول کی ضرورت نکاح بمعنی عقد میں پیش آتی ہے، بلکہ نکاح بمعنی عقد اسی ایجاب و قبول کا دوسرا نام ہے، اور اگر یہاں نکاح سے مراد عقد ہے، تو گزارش ہے کہ آپ کے اس فقرہ میں کہ ایجاب و قبول میں بلوغ شرط ہے، کس کا ایجاب و قبول مراد ہے؟ اگر کہئے میاں بیوی کا تو جناب والا کو معلوم ہونا چاہئے کہ نابالغوں کے نکاح میں ایجاب و قبول ان کے ولی و سرپرست کرتے ہیں، اور انہی کے ایجاب و قبول کا جس کو وہ نابالغ کی جانب سے بحیثیت سرپرست کرتے ہیں اعتبار کیا جاتا ہے، اور اگر کہئے کہ ولی یا اور سرپرستوں ہی کا ایجاب و قبول مراد ہے، تو صحیح ہے، لیکن ولی تو بالغ ہی ہوتا ہے، اور اسی کے ایجاب و قبول سے نابالغوں کا نکاح ہوتا ہے، جس میاں بیوی کی نابالغی کچھ

معتبر نہ ہوگی، پھر آپ نے یہ کیسے لکھ دیا، کہ اسلام میں نکاح ہی نہیں ہوتا، جب تک کہ عورت بالغ[1] نہ ہو۔“

ایجاب وقبول سرپرستوں کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے

اور اگر آپ کا خیال ہے کہ ولی کوئی چیز نہیں، اور جب تک کہ میاں بیوی ایجاب و قبول نہ کریں، نکاح نہیں ہوسکتا، اور نابالغ ایجاب وقبول کے اہل نہیں ہیں، اس لئے نابالغوں کا نکاح ممکن نہیں ہے، تو یہ محض بے بنیاد و بے دلیل خیال ہے مسلمانوں میں کوئی فرقہ آپ کا ہم خیال نہیں نہ اس خیال کی تائید کسی حدیث سے ہوتی ہے، نہ آیت سے، بلکہ قرآن کی متعدد آیات سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے، ایک مقام پر ارشاد ہے ”لَا تَنکِحُوا المشرکِیْنَ حَتّٰی یُؤْمِنُوا“ ”اے اولیاء! نہ نکاح کرو (اپنی بہن بیٹیوں کا) مشرکین سے یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں“ (یعنی جب وہ ایمان لائیں، تو اپنی لڑکیوں وغیرہ کو ان سے بیاہ سکتے ہو) دیکھئے یہاں ولی سرپرست مردوں کو خطاب کر کے یہ حکم دینا اس بات کی دلیل ہے کہ نکاح میں ان کو بھی دخل ہے، دوسری جگہ فرمایا ”وانکحوا الایامی منکم“ یعنی اے سرپرستو! اپنے خاندان کی ان عورتوں کا جن کے شوہر نہیں ہیں، کسی سے نکاح کردو۔“ اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ نکاح کر دینے کا اختیار سرپرستوں کو بھی حاصل ہے، اگر ان کو کچھ اختیار نہ ہوتا تو بے وجہ یہ حکم نہ دیا جاتا۔

اور حدیثوں میں بصراحت یہ حکم مذکور ہے کہ نابالغوں کا نکاح سرپرستوں کے

---

[1] سورۂ طلاق کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”وَالّٰئِی لَمْ یَحِضْنَ“ اس میں نابالغ لڑکیوں کی عدت بیان فرمائی گئی ہے، ظاہر ہے کہ اگر نابالغوں کا نکاح ناجائز ہوتا تو ان کے لئے عدت کی بھی ضرورت نہ تھی، نابالغہ کی عدت کا ہونا اس امر کی روشن اور کھلی ہوئی دلیل ہے، کہ یہ نکاح جائز ہے، نہ معلوم منکرین حدیث کی عقلیں اس درجہ مسخ کیوں ہوگئی ہیں کہ قرآن شریف کے ایسے آسان اور واضح مسائل کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ (قاضی عفا اللہ عنہ)

ایجاب وقبول سے ہو جاتا ہے۔

''حق گو'' کی دورنگی

مجھے ''حق گو'' صاحب کی اس دورنگی پر تعجب ہے، کہ وہ نکاح کے لئے گواہوں کا ہونا تو ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ گواہوں کی ضرورت بھی صرف حدیثوں سے ثابت ہے، قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن نابالغ کے نکاح کی صحت کو ولی کے ایجاب وقبول سے تسلیم نہیں کرتے، باوجودیکہ حدیثوں کے علاوہ قرآن سے بھی ثابت ہے۔

''حق گو'' صاحب کا یہ قول بھی محتاج دلیل ہے، کہ عرب میں بلوغ کی عمر ہمیشہ ہندوستان سے زیادہ رہی ہے ''حق گو'' صاحب نے کچھ نہ بتایا کہ ان کو اس کا کس طرح علم ہوا، اور اگر کہیں سے یہ ثابت بھی ہو جائے، تو آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ کبھی اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

خلاف عادت واقعات

کیا دنیا میں عادت کے خلاف واقعات نہیں ہوتے ہیں یہ موقع نہیں ورنہ میں آپ کے معصوم راویوں (یعنی عقلائے فرنگ) کی زبانی ایسے صدہا واقعات سناتا، اخبارات میں روزانہ ایسے واقعات کی اطلاعات شائع ہوتی رہتی ہیں پس اگر فرض بھی کر لیجئے، کہ عرب میں عموماً لڑکیاں ۹ برس میں بالغ نہ ہوتی ہوں، تو اس میں کیا استبعاد ہے، کہ کوئی لڑکی خلاف عادت ۹ ہی برس میں بالغ ہو جائے ''حق گو'' صاحب کو تو یہی مستبعد معلوم ہوتا ہے لیکن نہایت مستند طریق سے ثابت ہے کہ عرب میں بعض لڑکیاں نو[1] برس کی عمر میں ماں اور اٹھارہ برس کی عمر میں نانی ہوگئی ہوں۔[2]

---

[1] اخبار ''مدینہ'' بجنور مجریہ یکم جولائی ۳۴ میں یہ خبر کامل تحقیقات کے بعد شائع ہوئی ہے کہ وکٹوریہ ہسپتال دہلی میں ایک سات سال سے کم عمر کی لڑکی نے ایک بچہ جنا ہے ''جلت قدرتہ''۔ (اعظمی)

[2] دار قطنی: ص ۴۲۵

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی نسبت قابل وثوق ذرائع سے معلوم ہے، کہ ان کے جسمانی قوی بہت بہتر تھے، اور ان میں قوت نمو بہت زیادہ تھی، اس لئے بہت تھوڑی عمر میں وہ قوت ان میں پیدا ہو گئی تھی، جو شوہر کے پاس جانے کے واسطے ایک عورت کے لئے ضروری ہے، داؤدی نے لکھا ہے "وکانت عائشه شبت شبابا حسنا" یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بہت عمدگی کے ساتھ سن شباب تک ترقی کی تھی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے طبعی حالات تو ایسے تھے ہی، ان کی والدہ نے ان کے لئے ایسی غذا کا بھی خاص اہتمام کیا تھا کہ وہ جلد از جلد ترقی کر جائیں، چنانچہ ابوداؤد (جلد۲ صفحہ ۹۸) اور ابن ماجہ (صفحہ ۲۴۶) میں خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان مذکور ہے، کہ میری والدہ نے میری جسمانی ترقی کے لئے بہتیری تدبیریں کیں، آخر ایک تدبیر سے خاطر خواہ فائدہ ہوا، اور میرے جسمانی حالات میں بہترین انقلاب پیدا ہو گیا، اس کے ساتھ اس نکتہ کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے، کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو خود ان کی والدہ نے بدون اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے رخصتی کا تقاضا کیا گیا ہو، خدمت نبوی میں بھیجا تھا، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ پر کیا موقوف ہے کوئی ماں اپنی بیٹی کی دشمن نہیں ہوتی، بلکہ لڑکی سب سے زیادہ اپنی ماں ہی کی عزیز و محبوب ہوتی ہے، اس لئے ناممکن ہے کہ انہوں نے صلاحیت و اہلیت سے پہلے ان کو رخصت کیا ہو۔

اس حدیث کے غلط ہونے کی پہلی وجہ

اس کے بعد "حق گو" صاحب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی بعمر نہ سالگی کی تردید چار وجہوں سے کرتے ہیں:

> "اول حضرت اسماء حضرت عائشہ کی بہن ان سے دس سال بڑی تھیں، اور اسماء کی عمر انتقال کے وقت یعنی ۷۲ھ ("حق گو" صاحب نے سنہ غلط نقل کیا ہے، ۷۳ھ ہونا چاہئے) میں سو سال سے متجاوز تھی (صحیح یہ

ہے، کہ سو سال تھی) حضرت اسماء کے بڑے صاحبزادے عبدالرحمن بن زبیر آنحضرت ﷺ کے سامنے اس قدر جوان تھے کہ انہوں نے اس عورت سے نکاح کیا، جس نے اپنے شوہر کی شکایت کرتے ہوئے ان کو کپڑے کے کھونٹ سے مشابہت دی تھی، بہر حال ہجرت کے سال اسماء کی عمر ۲۵، ۲۶ سال سے کم نہ تھی، اور اس لئے حضرت عائشہ کا سن منگنی کے وقت ۱۴ سال اور نکاح کے وقت ۱۹ سال تھا۔“

”حق گو“ کی ”اعلیٰ قابلیت“ کے چند نمونے

”حق گو“ صاحب نے اس وجہ میں اپنی قابلیت کی خوب نمائش کی ہے، اکمال سے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا سن وفات ۷۶ھ نقل کیا، حالانکہ اس میں ۷۳ھ مذکور ہے، اسی کتاب سے ان کی عمر سو سال سے متجاوز بتائی، حالانکہ اس میں سو ہی کا ذکر ہے، ہجرت کے وقت حضرت اسماء رضی اللہ عنہ کی عمر ۲۵، ۲۶ سال بتائی، حالانکہ خود ان کی تحریر کے مطابق ۲۲ سال سے زیادہ نہیں ہوتی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر منگنی کے وقت ۱۶ بتائی، حالانکہ ان کی تحریر سے ہجرت کے وقت بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ عمر ثابت نہیں ہوتی بلکہ ۱۶ کے بجائے ۱۴ سال ثابت ہوتی ہے، اور چونکہ تاریخوں سے ثابت ہے، کہ ہجرت سے تین سال پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی منگنی یعنی عقد ہو چکا تھا،[1] پس ”حق گو“ صاحب کے مقدمات کی بنا پر منگنی کے وقت ۱۱، اور رخصتی کے وقت ۱۴ سال کی عمر ثابت ہوگی، اور سب سے بڑھ کر لطیفہ یہ ہے کہ ”حق گو“ صاحب نے عبدالرحمن ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کو جن کی بی بی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں شکایت کی تھی، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا بیٹا لکھ دیا، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، یہ عبدالرحمن نہ اسماء رضی اللہ عنہا کے بیٹے ہیں، نہ زبیر بن العوام شوہر اسماء رضی اللہ عنہا کے بلکہ وہ زبیر (بروزن

---

[1] زرقانی و فتح وغیرہ

کریم) ابن باطیا کے بیٹے ہیں۔[1]

’’حق گو‘‘ صاحب کی قابلیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ چند سطروں میں انہوں نے پانچ فاش غلطیاں کی ہیں۔

اکمال کی عبارت پر بحث

اس کے بعد اب اصل بحث پر گفتگو ہے، کہ بے شبہ اکمال کی عبارت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی چودہ سال کی عمر میں ہوئی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ صاحب اکمال نے اس عبارت میں کہیں ضرور غلطی کی ہے، ورنہ لازم آئے گا، کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اپنے شوہر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے ۹ سال بڑی ہوں، اس لئے کہ اکمال کی عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی عمر ہجرت کے سال ۲۷ برس کی تھی، اور مستدرک حاکم وغیرہ میں ہے کہ زبیر کی عمر اس وقت ۱۸ سال کی تھی، نیز یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پہلوٹے ہیں، اور ان کی پیدائش ہجرت کے پہلے ہی سال میں ہوئی، پس اگر ہجرت کے سال حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی عمر ستائیس سال ہو تو نہایت مستبعد معلوم ہوتا ہے، کہ عبداللہ پہلوٹے ہوں، اور ان سے پہلے حضرت اسماء رضی اللہ عنہ کے ۲۷ سال تک کوئی اولاد نہ ہوئی ہو، اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود ان کے دو کلاموں میں سخت تعارض واقع ہو جائے گا، اس لئے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے حال میں جو کچھ انہوں نے لکھا اس سے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر ہجرت کے سال ۱۷ برس ثابت ہوتی ہے، لیکن خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حال میں انہوں نے لکھا ہے کہ ہجرت کے ڈیڑھ سال بعد یا سات ماہ بعد ان کی عمر نو سال کی تھی، پھر دوسرا تعارض یہ ہے کہ ان کے پہلے قول کی بنا پر وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۲۷ سال

---

[1] فتح الباری: ۵/۲۷۵

ہوگی، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حال میں خود انہیں نے تصریح کی ہے، کہ ''اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی'' پس جب ان کے کلام میں تعارض واقع ہو گیا تو ان کا کلام قابل استدلال نہ رہا۔

دوسری وجہ

اس کے بعد ''حق گو'' صاحب کی دوسری وجہ ملاحظہ ہو:

> ''عبدالرحمٰن بن ابی بکر فتوحات شام میں قائد اعظم (سپہ سالار) تھے، اور وہ حضرت عائشہ سے سن میں اس قدر چھوٹے تھے، کہ حضرت عائشہ ان کو وضو کا طریقہ سکھایا کرتی تھیں، پس اگر حضرت عائشہ کا سن ہجرت میں نو سال رکھا جائے، تو اس حساب سے عبدالرحمٰن کی قیادت فتوحات شام میں اس قدر کمسنی میں پائی جاتی ہے، کہ محال ہے فتوحات شام ۱۶ھ کا واقعہ ہے۔''

''حق گو'' کے تاریخی معلومات کی رسوائی

''حق گو'' صاحب نے اس وجہ کو ذکر کر کے اپنی تاریخ دانی کو حد درجہ رسوا کر دیا، اولاً تو حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا، اپنے تمام بھائی بہنوں سے بڑے تھے، اور کتابوں کا ذکر چھوڑیے، خود اسی اکمال میں جس کا حوالہ ''حق گو'' صاحب نے پہلی وجہ میں دیا ہے مذکور ہے، ''وکان اسنّ ولد ابی بکر'' (یعنی) یہ اولاد ابوبکر میں سب سے بڑے تھے، حیرت ہے کہ ''حق گو'' صاحب نے دوسری وجہ لکھتے وقت اکمال کی طرف مراجعت کیوں نہیں کی، ثانیاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے طریقہ وضو سکھانے کا جو ذکر انہوں نے کیا ہے، اس کی اصلیت یہ ہے، کہ ایک دن حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور پانی مانگ کر وضو کرنے لگے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اعضاء کو اچھی طرح

اور پورا دھوئیے، اس واقعہ سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شاید حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے جلدی میں وضو کیا، اور کوئی جگہ خشک رہ گئی، اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو بالکل اسی طرح جس طرح کوئی چھوٹا آدمی اپنے بڑے کو اس کی بھول و چوک پر متنبہ کر دیتا ہے، حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کو ٹوک دیا، حدیث و تاریخ میں اس قسم کے صدہا واقعات ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے سے بہت معمر صحابیوں کو بہت بھیری باتیں بتائیں، تو کیا وہ سب صحابہ رضی اللہ عنہم ان سے کمسن قرار پائیں گے، ثالثاً اگر بالفرض حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چھوٹے بھی ہوں، تو فتوحات شام میں ان کی قیادت محال تو درکنار مستبعد بھی نہیں ہے، ”حق گو“ صاحب کے نزدیک اگر وضو کا طریقہ سکھانے کی وجہ سے حضرت عبدالرحمن کا چھوٹا ہونا ضروری ہو تو اس کے لئے نو برس چھوٹا ہونا ان کے نزدیک بھی بہت کافی ہوگا لیکن اس تقدیر پر بھی فتوحات شام کے ایام میں ان کی عمر ۱۹ سال ہوگی، جو قابلیت قیادت کے لئے بہت کافی ہے، ”حق گو“ صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ قیادت جنگ کے لئے پیر فانی ہونا شرط نہیں ہے، قابل ہونا چاہئے، خواہ وہ نوجوان ہی ہو، اور اس کے لئے ان کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت کا واقعہ پڑھنا چاہئے جن کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قائد مقرر کیا تھا، باوجودیکہ اس وقت ان کی عمر ۱۸ یا ۲۰ سال تھی۔[1]

تیسری وجہ

”حق گو“ صاحب نے یہ ذکر کی ہے:

> ”یہ ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جنگ جمل میں شرکت کی، اور قرآن سے ظاہر ہے کہ امہات المومنین کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں، تاوقتیکہ وہ مستثنیات میں داخل نہ ہو جائیں، یعنی بوڑھی نہ ہو جائیں، پس اگر ان کی مفروضہ عمر (یعنی نو سال رخصتی کے وقت) تسلیم کر لی جائے، تو

---

[1] اصابہ

جنگ جمل میں ان کا بڑھاپا نہ آیا، (لہذا قرآن کی مخالفت لازم آئے گی) اور یہ حضرت عائشہ سے نہایت بعید ہے۔"

اس کا جواب

"حق گو" صاحب کی یہ وجہ بھی ان کے قلت تدبر کی شرمندہ احسان ہے، قرآن پاک میں ازواج مطہرات کو گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت مطلق نہیں ہے، بلکہ یہ ممانعت اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے، کہ زمانہ جاہلیت کے انداز پر نکلنا ہو، یعنی زیب و زینت کے ساتھ رنگین لباسوں میں ملبوس ہو کر بے پردہ نکلنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے، قرآن کریم کے صریح الفاظ ہیں "وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى" (یعنی اپنے گھروں میں قرار پکڑو، اور جاہلیت قدیم کے انداز پر بناؤ سنگار کر کے نہ نکلو) لہذا جب بے بناؤ سنگار کے اور با پردہ نکلنے کو قرآن نے منع کیا ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چاہے جس سن میں بھی جنگ جمل میں شریک ہوئی ہوں، اس آیت کی مخالفت لازم نہیں آسکتی، اور نہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکلنا قابل اعتراض ہو سکتا ہے، تاریخوں سے ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہودج میں سوار ہو کر پورے پردے کے ساتھ گئی تھیں۔ "حق گو" صاحب نے اس پر بھی غور نہ کیا کہ اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ازواج مطہرات کو لے کر حج و عمرہ کے لئے گھر سے نکلے، پس اگر یہ حکم مطلق ہوتا، تو کیونکر ممکن تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو لے کر جاتے۔

پھر یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ قرآن میں اس آیت کے بعد ایک اور آیت بھی ہے، جس میں ازواج مطہرات کو گھونگھٹ نکالنے کا حکم دیا گیا ہے، پس اگر ان کے لئے باہر نکلنا قطعاً ممنوع ہے، تو گھونگھٹ نکالنے کا حکم دینا بے ضرورت ہوگا، اس لئے کہ اس کی ضرورت تو باہر ہی نکلنے میں پیش آسکتی ہے۔

اچھا ان سب باتوں کو جانے دیجئے اور فرض کر لیجئے کہ ''حق گو'' صاحب کے تمام مقدمات صحیح ہیں، جب بھی تو ان کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ جنگ جمل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بڑھاپا نہ آیا تھا، معلوم ہوتا ہے ''حق گو'' صاحب کو واقفیت نہیں ہے کہ جنگ جمل ۳۶ھ کا واقعہ ہے، اور رخصتی کے وقت اگر ان کی عمر نو سال مانی جائے تو جنگ جمل میں ان کی عمر ۴۵ سال ہوتی ہے، اور اس عمر کو خود ''حق گو'' صاحب بڑھاپے کی عمر مانتے ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ وہ اسی رسالہ کے (صفحہ ۸) میں لکھ چکے ہیں، کہ:

> ''(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی ساری جوانی ایک بوڑھی بیوہ کے ساتھ گزار چکے تھے۔''

ظاہر ہے کہ اس ''بوڑھی بیوہ'' سے مراد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں، اور تاریخوں سے ثابت ہے کہ ان کی عمر نکاح کے وقت ۴۵ سال سے کسی طرح زیادہ نہ تھی، بلکہ اکثر اصحاب سیرۃ کے قول پر ۴۰ سال سے زیادہ نہ تھی۔

پس حیرت ہے کہ جب بقول ''حق گو'' صاحب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بڑھاپا ۴۰ سال کی عمر میں آگیا تھا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بڑھاپا ۴۵ سال کی عمر میں کیسے نہیں آیا؟

چوتھی وجہ

اس کے بعد ''حق گو'' صاحب نے چوتھی وجہ یہ ذکر کی ہے کہ:

> ''عمروں کے متعلق روایتیں نہایت متضاد ہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حضرت فاطمہ کا کس سنہ میں انتقال ہوا، اور ان کی کیا عمر تھی، حضرت عائشہ کی (رحلت) کے متعلق روایات مختلف ہیں۔''

اختلاف روایات سے کوئی فن بے اعتبار نہیں ہو سکتا

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عمروں کے متعلق روایات مختلف ہوتی ہیں، لیکن تنقید

روایات کے اصول سے محقق اور راجح بات کا پتہ چل جاتا ہے، لہٰذا اس اختلاف کی بنا پر فن بے اعتبار نہیں ہو سکتا، علاوہ بریں یہاں اس تفصیل کا ذکر بالکل بے محل ہے، اس لئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی بعمر نو سال کے خلاف کوئی روایت موجود ہی نہیں، صحیحین کے علاوہ اور جہاں جہاں ان کی رخصتی کا ذکر ہے، سب جگہ ۹ ہی سال میں رخصتی کو لکھا ہے کیا ''حق گو'' صاحب اس کے خلاف کوئی روایت پیش کر سکتے ہیں؟

''حق گو'' صاحب کے ملحدانہ بیانات

مذکورہ بالا سات عنوانوں کے بعد ''حق گو'' صاحب نے چند اور دلآزار عنوان قائم کئے ہیں، اور ان کے ماتحت نہایت آزادی سے اپنے ملحدانہ خیالات کو ظاہر کیا ہے، اور محدثین کرام و فقہائے اسلام رحمہم اللہ پر خوب گندگیاں اچھالی ہیں، یہ عنوانات بجائے خود ان کی بے دینی و الحاد کے مستقل دلائل ہیں، چند عنوان ملاحظہ ہوں، ''یہودیت و حدیث'' ''مسیحیت و حدیث'' اور ''حدیث و مجوسیت'' ان عنوانات کے ماتحت ''حق گو'' صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ حدیث کا تمام تر سرمایہ انہی غیر مسلم قوموں سے ہاتھ آیا ہے، اور محدثین نے انہی قوموں کی باتوں کو سن سن کر اور ہر بات کے لئے ایک فرضی اسناد بنا کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا ہے، مگر افسوس ہے کہ اپنے تخیلات فاسدہ اور توہمات باطلہ کے سوا اس بیان کی کوئی دلیل انہوں نے ذکر نہیں کی، پس اس حالت میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی باتیں کہاں تک قابل التفات و توجہ ہو سکتی ہیں، کیا ''حق گو'' صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی دان طبقہ جس میں وہ اپنے ملحدانہ خیالات کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں، ان کی ہر بے دلیل بات اور بے ثبوت دعویٰ کو تسلیم کر لے گا، کیا یہ طبقہ تاریخی حقائق کے خلاف آپ کے بے بنیاد مزعومات کو بے تامل مان لے گا، ہم کو حیرت ہے کہ ''حق گو'' صاحب

نے اس طبقہ کی نسبت یہ خیال کیسے قائم کرلیا، اور مستند تاریخی بیانات کے خلاف ان کو یہ لکھنے کی کیونکر جرأت ہوئی کہ۔

> ”خلفائے راشدین کے زمانہ میں اور خصوصاً حضرت عمر کے سامنے کسی کی مجال نہ پڑتی تھی کہ وہ کوئی حدیث بیان کرے اور یقینی بات ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانے سے قبل تک لوگ حدیثوں کو نہ جانتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جو سنگین واقعات اس سے پہلے پیش آئے مثلاً شہادت امام حسین وعبداللہ بن زبیر وفتنہ وبغاوت بزمانہ عثمان اور جنگ جمل وغیرہ ان میں سے ایک کا بھی اشارہ قیامت کی پیشین گوئیوں کے سلسلہ میں نہیں ہے۔“

صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایت حدیث اور ان کا حدیث کے سامنے سر تسلیم خم کرنا

”حق گو“ صاحب نے ان سطروں میں جن تاریخی حقائق کا انکار کیا ہے، ان کے انکار کی جرأت کوئی حیادار انسان نہیں کرسکتا، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے خود حدیثیں بیان کی ہیں، اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بہت سے مقدمات میں حدیثیں دریافت کرکے ان کے مطابق فیصلے کیے ہیں، تاریخ الخلفاء تاریخ کی چھوٹی سی کتاب ہے، اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیان کی ہوئی ایک سو چار حدیثوں کا ذکر موجود ہے، اور تاریخوں میں یہ بھی بصراحت مذکور ہے کہ جب صحابہ میں اختلاف ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں دفن کیا جائے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث سنا کر اس اختلاف کو رفع کیا، پھر خلافت کے مسئلہ میں انصار ومہاجرین کا اختلاف ہوا تو، اس موقع پر بھی انصار کے مناقب اور قریش کے استحقاق خلافت کی حدیثیں سنا کر دونوں گروہوں کو متفق کردیا، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ان کے سامنے

روایت حدیث کی ہے۔

روایت حدیث میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی احتیاط

ہاں اتنا ضرور ہے کہ حضرت شیخین خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سخت تاکید تھی کہ حدیثوں کے بیان کرنے میں بے احتیاطی نہ کی جائے، خوب غور وفکر کر کے صحیح بات بیان کی جائے ایسا نہ ہو کہ زیادہ گوئی میں کوئی غلط بات آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب ہو جائے، یہ ساری باتیں علامہ سیوطی رحمہ اللہ، علامہ ذہبی رحمہ اللہ وغیرہ کی تاریخی تصنیفات میں تفصیل سے مذکور ہیں، اور یہی حال حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کا بھی تھا، لہٰذا یہ کہنا کہ۔

> ”عمر بن عبدالعزیز سے پہلے لوگ حدیثوں کو نہ جانتے تھے۔“

ایسا جھوٹ ہے، جس کی کوئی تاویل ممکن نہیں ہے، ”حق گو“ صاحب کو اگر عربی کتابوں پر دسترس حاصل نہ تھا، تو کم از کم سیرۃ النبی ﷺ کا مقدمہ ہی ملاحظہ کر لیتے، ہندوستان کا یہ وسیع النظر مورخ کتنی صراحت سے لکھتا ہے کہ۔

> ”صحابہ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں اگرچہ فقہ وحدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی، اور بہت سے درس کے حلقے قائم ہوئے، لیکن جو کچھ تھا زیادہ تر زبانی تھا۔“

اس کے بعد بنو امیہ کے عہد میں تصنیف وتالیف کے شروع ہونے کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ:

> ”حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا زمانہ آیا، تو انہوں نے تصنیف و تالیف کو زیادہ ترقی دی۔“

ان اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے کہ۔

1. صحابہ وخلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں بکثرت احادیث کی روایت ہوئی۔
2. کچھ حدیثیں قید کتابت میں بھی آئی ہیں لیکن زیادہ تر زبانی روایت ہوتی تھی۔

③ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانہ سے پہلے ہی تصنیف کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

④ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانہ میں تصنیف کو ترقی ہوئی۔

لہٰذا ''حق گو'' صاحب کا یہ کہنا کہ:

''حدیث کی سب سے پہلی کتاب جو مدون ہوئی وہ ابن جریج المتوفی ۱۵۰ئی ہے۔''

بالکل غلط ہے، اس لئے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس سے پہلے بھی حدیث کی کتابیں لکھوا چکے تھے، اور ان کا زمانہ خلافت ۹۹ھ سے ۱۰۱ھ تک ہے، بلکہ ان سے پہلے بھی تصنیفیں ہو چکی تھیں۔

مغازی پر حملہ

بہرحال ''حق گو'' صاحب کے مذکورہ بالا بیان کے غلط ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں لیکن اس کو چھوڑیئے اور ان کی یہ بات یاد رکھئے کہ۔

''عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے پہلے کوئی حدیثوں کو جانتا نہ تھا۔''

اور اس کے بعد ان کا دوسرا بیان پڑھئے لکھتے ہیں:

''ایک ہی صدی کے بعد..... وضع حدیث کی گرم بازاری ہوئی،...... مسلمانوں کا پہلا دور فتوحات ملکی اور سیاست کا تھا، اس دور میں اگر انہوں نے رسول اللہ کی مبارک سیرت کے کسی شعبہ سے اعتناء کیا ہے تو وہ آپ کی سنیت وعبادت نہیں ہے، بلکہ مغازیات ہے...... لیکن جس شخص نے اس پر سب سے پہلے نظر ڈالی ہے، وہ اپنی روایتوں میں حد درجہ ناقابل اعتبار ہے، اور یقیناً سلاطین وقت کی عام خونریزیاں اور یہودیوں کی وہ خرافات واتہام، جو وہ داؤد اور سلیمان اور یوشع پر لگاتے

تھے ان کی صدائے بازگشت ان مغازیات میں ہے۔"

"حق گو" صاحب کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھئے اور بتائیے کہ بجز اس شخص کے جس کے دماغ میں خلل ہو کسی اور کے قلم سے ایسی باتیں نکل سکتی ہیں، میں "حق گو" صاحب سے پوچھتا ہوں کہ وفات نبوی کے بعد مسلمانوں کا پہلا دور تو خلافت راشدہ کا دور ہے، تو کیا اسی زمانہ میں مغازی رسول اللہ ﷺ کی تصنیف شروع ہوئی ہے، اور کیا اس دور میں بھی لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی سنت وعبادت کے ساتھ اعتناء نہیں تھا اور کیا خلافت راشدہ کے دور میں بھی عام خونریزی اور جبر واستبداد جاری تھا۔

مغازی کی طرف سب سے پہلے کس نے توجہ کی؟

حالانکہ فن تاریخ کا ابجد خواں بھی جانتا ہے کہ مغازی کی طرف حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانہ میں توجہ ہوئی، اور اسی زمانہ میں امام زہری المتوفی ۱۲۴ھ نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی، اور ان کے بعد ان کے شاگرد موسیٰ ابن عقبہ المتوفی ۱۴۱ھ اور ابن اسحاق المتوفی ۱۵۲ھ نے اس پر کتابیں لکھیں، پس اس بنا پر مغازی پر پہلے نظر ڈالنے والے زہری ہیں اور وہ بالاتفاق معتبر اور قابل استناد راوی ہیں، معلوم ہوتا ہے "حق گو" صاحب نے اپنی بے بضاعتی کے باعث یہ سمجھ رکھا ہے، کہ مغازی پر سب سے پہلے نظر ڈالنے والا واقدی ہے، اور وہ دور اول کا آدمی ہے، حالانکہ واقدی کو دور اول سے کچھ تعلق نہیں ہے، وہ تو زہری کے شاگردوں سے بھی متاخر ہے، واقدی کی وفات ۲۰۷ھ میں ہوئی۔[1]

"حق گو" دشمنان اسلام کی صف میں

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

---

[1] کتابت حدیث کی مکمل تاریخ مقدمہ میں ملاحظہ کیجئے۔ ۱۲ منہ

> ”اس کے بعد نظامِ ملکی کے لئے فقہ کی ضرورت ہوئی، اگرچہ اس کا مواد زیادہ تر رومیوں اور ایرانیوں کے متداول قوانین سے آیا ہے، لیکن اس کی سند راویوں کے سلسلہ سے رسول اللہ ﷺ تک پہنچادی گئی ہے۔“

اس اقتباس کو پڑھ کر انصاف سے کہئے کہ ”حق گو“ صاحب اپنی اسلام دشمنی میں متعصب غیر مسلموں سے بھی دو قدم آگے ہیں یا نہیں؟ اللہ اللہ! ”حق گو“ صاحب مسلمان کہلا کر یہ اعتقاد رکھتے ہیں، کہ اسلام کا قانون نہایت ناکمل تھا، اس میں نظامِ ملکی کے قوانین نہیں تھے، اور قرآن و مبلغ قرآن نے اپنے ماننے والوں کو آئینِ حکومت اور نظامِ سلطنت نہ بتائے تھے، اور مسلمانوں کو اس کے لئے دوسروں کا محتاج اور دست نگر رکھا تھا، چنانچہ اسی بے آئینی کے ساتھ حضرت ابوبکر نے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے، حضرت عثمان نے، حضرت علی نے، اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہم) نے اور ان تمام خلفاء کے عمال نے، بلکہ ایک صدی کے بعد تک تمام خلفاء و امراء نے حکومت کی، ایک صدی کے بعد جب ایرانیوں اور رومیوں کے قوانین سے سرقہ کیا گیا، تو اس وقت مسلمانوں کے قوانین نظامِ حکومت مرتب ہوئے، بتائیے کہ ایک غیر مسلم اس سے زیادہ اسلام کی اور کیا توہین کر سکتا ہے؟

اسلامی قوانین کی اکملیت

افسوس ہے کہ ”حق گو“ صاحب کو شرم نہیں معلوم ہوتی کہ وہ مدعی اسلام ہو کر یہ بک رہے ہیں، اور ایک غیر مسلم ”موسیو اوجین کلوفل“ یہ لکھ رہا ہے، کہ

> ”جب کوئی شخص قرآن کی آیتوں کو اس طرح مرتب کرے گا، تو وہ ہماری طرح یقیناً ذیل کے نتائج پر پہنچے گا (اول) یہ کہ محمد (ﷺ) نے ایک کامل مجموعہ تمدنی قوانین کا دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔“

اور مشہور مسیحی مورخ ایڈورڈ گبن لکھتا ہے:

”بحر اوقیانوس سے لے کر دریائے گنگا کی انتہا تک الغرض مشرق سے لے کر مغرب تک قرآن مجید کو نہ صرف اصول دین کے لئے قانون اساسی تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ احکام تعزیرات، اصول تمدن و اجتماع، قوانین معاشرت، انسانی زندگی کے مختلف نظامات اور ان کی ترتیب بیان کرنے کے لئے ایک جامع کتاب ہے“.........

خلاصہ یہ کہ شریعت محمدیہ کی بنیاد ایسے مستحکم اور مضبوط اصول پر قائم کی گئی ہے، جس کی نظیر تمام دنیا کے ادیان و مذاہب میں نہیں پائی جاتی۔“

اور مسٹر ای، ڈی، مرل لکھتا ہے کہ:

”اسلام افریقہ کے حبشیوں کے دلوں میں تہذیب و شائستگی کی روح پھونکنے، سول گورنمنٹ کا نظام اور حدود و عدالت کے قائم کرنے میں بڑا معاون ثابت ہوا ہے، قرآن ہی پیروان اسلام کا قانون اساسی ہے، اور وہی ان کا دستور العمل اور وہی ان کے حقوق کی دستاویز ہے، اکثر اوقات اس امر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اسلام نہ صرف ایک مذہب کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ وہ ایک نظام تمدن بھی ہے۔“

اور موسیو یون راس لکھتا ہے کہ:

”اسلام ایک جامع الکمالات قانون ہے، جس کو انسانی، مجلسی، اقتصادی، اور اخلاقی قانون کہنا بالکل بجا اور درست ہے، زمانہ حال میں جتنے قوانین نوع انسان کی فلاح کے لئے وضع کئے گئے ہیں، وہ سب اس مقدس مذہب میں پہلے سے مفصل موجود ہیں۔“

اس قسم کے اقوال کہاں تک نقل کئے جائیں، خلاصہ یہ ہے کہ بابصیرت انسان چاہے وہ موافق ہو یا مخالف جانتا ہے کہ قانون اسلامی نہایت اکمل اور تمام قوانین سے اعلیٰ و ارفع قانون ہے، اور اسلام کا پیرو انسان دنیا کے کسی قانون کا محتاج نہیں

ہے، قرآن زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح وبقا وترقی کے قوانین پر مشتمل ہے، اور اس قانون کے مبلغ علیہ السلام نے اپنے قول وفعل سے پوری تشریح کر کے تمام قانون سے بے نیاز کر دیا ہے۔

شریعت اسلامیہ کی توہین

پس جب مخالفین کی تصریحات سے ثابت ہو گیا کہ اسلام نظام ملکی یا ضروریات مذہبی کسی چیز میں بھی کسی دوسرے کا محتاج نہیں تو ”حق گو“ صاحب کا یہ لکھنا اسلام کی صریح توہین اور اپنی اسلام دشمنی کا ثبوت دینا ہے یا نہیں کہ:

> ”مذہبی مسائل میں بالکل یہود کے مذہبی مسائل کی تقلید ہونے لگی، اور جب مذہبی قانون بننا شروع ہوا، تو اس سے زیادہ آسان بات کیا ہو سکتی تھی، کہ ہر ایسے مسئلہ میں جس پر قرآن نے کچھ نہ کہا ہو، اور جس پر سنت متواترہ اور مسلمانوں کا عمل بھی نہیں ہے، اس کو یہود ونصاریٰ سے لے کر اس پر فرضی سند لگا کر حدیث رسول کے نام سے پیش کر دیا جائے...... نتیجہ یہ ہوا کہ دو صدی کے اندر یہود کی پوری شریعت اپنے [illegible] چولے میں مسلمانوں پر ڈال دی گئی۔“[1]

شریعت اسلامیہ کی اس سے زیادہ توہین کیا ہو سکتی ہے، کہ ”حق گو“ صاحب کے زعم فاسد میں قرآن اور مبلغ علیہ السلام کی شریعت اتنی ناقص تھی کہ نہ اس میں قوانین ملکی تھے، نہ مسائل مذہبی، اس لئے قوانین حکومت کو تو مسلمانوں نے رومیوں اور ایرانیوں سے چرایا اور مسائل مذہبی کا یہود ونصاریٰ سے سرقہ کیا۔

اگر ”حق گو“ صاحب کہیں کہ میں ان چیزوں کی کلیۃً نفی نہیں کرتا، بلکہ یہ کہتا ہوں کہ کچھ باتیں مذہب وسیاست کی اسلام میں تھیں، اور جو نہیں تھیں، ان کو غیروں سے لیا گیا...... تو میں عرض کروں گا کہ پھر قرآن نے یہ دعویٰ کیوں کیا ”اَلْیَوْمَ

---

[1] رسالہ منکرین حدیث: ص ١١

اَکْمَلْتُ لَكُمْ دِینَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ" نیز مخالفین اسلام کے اقوال سے ابھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ اسلام سے زیادہ مکمل مذہب وقانون دوسرا کوئی مذہب وقانون نہیں ہے، پس اسلامیوں کو یہود ونصاریٰ یا رومی وایرانی قوموں سے کچھ اخذ کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آسکتی ہے" "حق گو" صاحب اب بھی ہوش میں آؤ، اور دیکھو کہ حدیثوں سے دشمنی کرکے تم اسلام کے بھی دشمن ہوگئے یا نہیں؟

ابن خلدون کی عبارت کے ترجمہ میں "حق گو" صاحب کی خیانت

اس مقام پر پہنچ کر ظاہر کردینا ضروری ہے کہ "حق گو" صاحب نے اس مطلب پر کہ:

"مسلمانوں نے یہودیوں سے باتیں سیکھ کر داخل مذہب کرلیں۔"

مقدمہ ابن خلدون کی ایک عبارت سے استدلال کیا ہے، لیکن افسوس ہے، کہ انہوں نے اس عبارت کے ترجمہ میں بدترین خیانت سے کام لیا ہے، سنئے قصہ یوں ہے کہ بعض مفسرین نے کتب تفاسیر میں کچھ اسرائیلی اقوال نقل کردیئے ہیں ان تفسیروں کے ذکر کے سلسلہ میں ابن خلدون نے یہ لکھا ہے کہ:

> "اسلام سے پہلے عرب کے پاس نہ کوئی کتاب آسمانی تھی، نہ علم تھا، اس لئے جب ان کو موجودات کے اسباب اور کائنات کی پیدائش کی ابتداء اور وجود کے اسرار کی نسبت کچھ معلوم کرنے کا شوق ہوتا تھا، تو یہود و نصاریٰ سے پوچھ لیتے، پس جب اسلام لائے، تو جن چیزوں کا تعلق احکام شرعیہ سے نہ تھا، وہ چیزیں ان میں باقی رہ گئیں، مثلاً کائنات کی پیدائش کی ابتداء وغیرہ۔"

ابن خلدون کے اس کلام میں مصرح ہے کہ یہودیوں سے دریافت کرنے کا

قصہ اسلام سے پہلے کا ہے، اور یہ بھی مصرح ہے کہ یہودیوں کی صرف وہی باتیں ان مخصوص مسلمانوں میں رہ گئی تھیں، جن کا کوئی تعلق احکام شرعیہ سے نہ تھا، اور وہ ایسی باتیں تھیں کہ ان کے لئے احکام شرعیہ کی سی احتیاط کی ضرورت نہ تھی، اور یہ کہ ان باتوں پر وہی قائم رہے جنہوں نے پوچھا تھا، یہ نہیں کہ سب مسلمانوں نے ان کو تسلیم کرلیا، اور یہ کہ ابن خلدون نے یہ بات کتب تفسیر کے اسرائیلی اقوال کی نسبت لکھی ہے، مگر ''حق گو'' صاحب نے غایت ''دیانت داری'' سے اس کلام کو ''یہودیت و حدیث'' کے عنوان کے ماتحت درج کیا، اور ابن خلدون کے اس فقرہ ''فلما اسلموا بقوا على ماكان عندهم مِمَّا له تعلق لا بالاحكام الشرعية التى يحتاطُونَ لَهَا مِثل اخبار بَدْأ الخليقة الخ'' کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ:

> ''جب مسلمان ہوئے تو جن باتوں کی احکام شریعت سے احتیاط کی جاتی تھی، تعلق نہ رہا، مثلاً ابتدائے خلق اور قرب قیامت کی نشانیاں اور فتن کی خبریں وہ سب ان کی وجہ سے مسلمانوں میں اب تک رہ گئیں۔''

حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ:

> ''جب وہ مسلمان ہوئے، تو وہ احکام شرعیہ جن کے لئے وہ احتیاط برتا کرتے تھے، ان سے جن باتوں کا تعلق نہ تھا، ان باتوں پر قائم رہ گئے۔''

حاصل کلام یہ کہ ابن خلدون کا یہ کلام حدیث کی نسبت نہیں ہے، بلکہ بعض تفسیروں کے اسرائیلی اقوال کی نسبت ہے اور وہ اقوال احکام شرعیہ سے متعلق نہیں ہیں، لہٰذا یہاں اس کلام کو پیش کرنا خیانت ہے، پھر یہ بھی سن لیجئے کہ ان اسرائیلی اقوال کو علمائے ملت نے قبول نہیں کیا، چنانچہ خود اسی مقدمہ میں آگے چل کر مصرح ہے، کہ پچھلے مفسرین نے تحقیق وتمحیص کرکے ان اقوال کو نکال ڈالا۔

یہود ونصاریٰ سے مسائل اخذ کرنے کی ممانعت حدیث میں

”حق گو“ صاحب نے مسلمانوں پر یہ الزام لگا تو دیا کہ انہوں نے یہود ونصاریٰ سے مسائل اخذ کیے، لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ اس کا کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے، اور نہ اس کے لئے کوئی تاریخی شہادت ہی ذکر کی، بلکہ آپ نے دیکھ لیا کہ انکا یہ الزام قرآن کے خلاف بلکہ ان غیر مسلموں کی تصریحات کے بھی خلاف ہے، جن کو ”حق گو“ صاحب بالکل معصوم تصور کرتے ہیں، اب میں ”حق گو“ صاحب کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ عقل سے ذرا کام لیتے، تو یہ الزام قائم کرنے کی ان کو جرأت نہ ہوتی، انہوں نے حدیث کا مطالعہ کیا ہوگا، تو ان کو معلوم ہوگا کہ متعدد احادیث میں یہود ونصاریٰ سے اخذ مسائل کرنے کی ممانعت مصرح ہے، اور ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک سب حدیثیں بناوٹی ہیں، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ جب واضعین حدیث نے یہود ونصاریٰ سے مسائل حاصل کئے اور ان کی پوری شریعت کو ایک نئے قالب میں ڈھال لیا، تو پھر انہوں نے یہ حدیثیں کیوں وضع کیں، یہ حدیثیں تو ان مقاصد کے لئے بے حد مضر ہیں، مثلاً ایک حدیث ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آنحضرت ﷺ سے کہا کہ ہم یہودیوں کی باتیں سنتے ہیں، تو ہم کو بہت بھلی لگتی ہیں اجازت دیجئے تو ہم ان کو لکھ لیں، آنحضرت ﷺ یہ سن کر بہت برہم ہوئے، اور فرمایا کہ ان کی طرح کیا تم کو بھی اپنی تشفی کے لئے غیروں کے دروازے پر دستک دینے کی ضرورت ہے، حالانکہ میں تو جو شریعت لایا ہوں، وہ بالکل روشن اور صاف سیدھی ہے، اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو میرے اتباع کے بغیر چارہ نہیں ہوتا مطلب یہ ہے کہ تم کو اپنے

نبی اور اپنی کتاب کے سوا کسی دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ "حق گو" صاحب اس حدیث کو پڑھیں، اور بتائیں کہ یہ حدیث لوگوں نے کیوں "وضع" کی، اور اس کو "وضع" کر کے خواہ مخواہ اپنے پاؤں میں کیوں کلہاڑی ماری؟

اس مضمون کی اور حدیثیں بھی ہیں، منجملہ ان کے ایک وہ حدیث بھی ہے، جس کو "حق گو" صاحب نے (صفحہ ۱۲) میں نقل کیا ہے، کہ:

> "اہل کتاب اپنی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر کے مسلمانوں کو عہد نبوی میں سنایا کرتے تھے، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اہل کتاب کی باتوں کو جھوٹی بھی نہ کہو لیکن اس کی تصدیق بھی نہ کرو۔"

"حق گو" صاحب اس حدیث کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس کو مدینہ کا نہیں، بلکہ شام کا واقعہ قرار دیتے ہیں، یعنی عہد نبوی کے بعد جب شام فتح ہوا ہے، لیکن سوال ہے کہ اس وقت آنحضرت ﷺ کہاں تھے، جو مذکورہ بالا حکم فرماتے؟ "حق گو" صاحب نے اس کو شام کا واقعہ اس لئے قرار دیا ہے کہ جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مدینہ آئے ہیں، اس وقت یہود مدینہ سے نکل چکے تھے، لیکن "حق گو" صاحب کا یہ استدلال غلط ہے، اس لئے کہ اس سے صرف یہ لازم آتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کا نہیں ہے، لیکن یہ کہتا کون ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کا ہے، واقعہ ان کے آنے سے پہلے کا ہے، لیکن جب وہ مدینہ میں آئے، تو ان سے کسی نے بیان کیا، انہوں نے اس بیان کی حکایت کر دی، اسی طرح صدہا واقعات انہوں نے بیان کئے ہیں، اور ہم کو تو ان باتوں سے کوئی بحث نہیں، ہم تو صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں، کہ اگر "واضعین حدیث" نے یہود ونصاریٰ سے باتیں حاصل کی ہوتیں، تو اس حدیث کو ہرگز دفاترِ حدیث میں جگہ نہ دیتے اس لئے کہ اس سے ان کو سخت نقصان پہنچتا ہے، اور ان کے فعل کی مذمت نکلتی ہے۔

"حق گو" صاحب کی خبط الحواسی

"حق گو" صاحب غایت بدحواسی کے عالم میں لکھتے ہیں کہ:

> "یہودیوں میں اولین فرائض وہی تھے، جو ہمارے ہاں ہیں، یعنی صلوٰۃ وصیام و زکوٰۃ، مگر جب مشنا کا رواج یہودیوں میں ہوا تو انہوں نے نمازیں اور روزے ضائع کر دیئے، اور زکوٰۃ کی جگہ سود لینے لگے، اور لگے قربانی اور سبت اور اس طرح کے طفلانہ احکام پر سختی سے عمل کرنے، اس لئے شام وعراق میں یہودیوں کے ساتھ بود و باش کرنے میں مسلمانوں نے انہی اعمال کی نقل کی جن کا اصل ماخذ مشنا تھا۔"

لیکن کیا "حق گو" صاحب ذرا اپنے حواس درست کر کے یہ بتا سکتے ہیں کہ حدیثوں میں سبت کی تعظیم اور ان کے احکام کا ذکر کس جگہ ہے، جو یہودیوں میں رائج تھے، اسی طرح قربانی کے احکام جو مشنا میں درج ہیں، اور یہودیوں کا ان پر عملدرآمد تھا، وہ حدیث یا فقہ میں کہا ہیں "حق گو" صاحب! آپ جھوٹ تو بولتے ہیں، لیکن آپ کو جھوٹ بولنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے، آپ اگر آنکھیں کھول کر دیکھتے تو آپ کو نظر آتا کہ حدیث وفقہ کی کتابوں میں سب سے پہلے پاکی اس کے بعد نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ابواب نہایت جلی خط میں لکھے ہوئے ہیں، اور سبت وقربانی یہود کا کوئی ذکر نہیں ملتا، پس اگر مسلمانوں نے یہودیوں کے اعمال کی نقل کی ہوتی، تو اس کے برعکس ہوتا، اگر عقل ہو تو سوچیے کہ یہود نے نماز، روزہ کو بھلا دیا تھا، اور زکوٰۃ کی جگہ سود لینے لگے تھے، اور مسلمان بقول آپ کے انہی کے مقلد تھے، تو مسمانوں نے کیوں اور کہاں سے نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی فرضیت اور اس کے مسائل کی تفصیل حدیث وفقہ میں لکھی، اور خواہ مخواہ کے لئے اتنے جھگڑے اپنے سر لئے؟ اور جواز سود، جیسے "سود مند" مسئلہ کو قبول کرنے کے بجائے اپنی کتابوں میں "ابواب الربوا"

کے عنوانات قائم کر کے سود لینے کی ہزاروں برائیاں اور سودی لین دین کی صدہا صورتیں لکھ کر ان کو حرام قرار دے لیا اور وسائل معاش کو اپنے اوپر تنگ کر لیا بلکہ اگر آپ تتبع سے کام لیتے تو آپ کو حدیثوں میں صاف لکھا ہوا ملتا کہ سبت کے احکام یہود کے ساتھ مخصوص تھے، مسلمان ان احکامات کے مکلف نہیں ہیں، بتائیے کہ جب واضعین حدیث یہود کے مقلد تھے، تو یہ حدیث انہوں نے کیوں وضع کی؟

تصویر کی حرمت وحلت کا مسئلہ

”حق گو“ صاحب نے تقلید یہود کی مثال میں تصویر بنانے کی حرمت کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ:

> ”تصاویر کے متعلق قرآن میں کوئی وعید نہیں ہے، بلکہ اس کے برخلاف سلیمان کے تذکرہ میں وارد ہے۔ ”یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا یَشَاءُ مِنْ مَحَارِیْبَ وَ تَمَاثِیْلَ“ البتہ شامی ربیوں نے تصاویر کی سخت ممانعت کی ہے۔“

”حق گو“ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں تو تصویر کی ممانعت ہے نہیں، لہذا مسلمانوں نے بہ تقلید یہود اس کی حرمت کی حدیثیں بنالیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس تقلید میں مسلمانوں کا کیا فائدہ تھا، تصویر کو حرام کرنے سے ان کو کس دنیاوی منفعت کی توقع تھی کہ انہوں نے بخیال ”حق گو“ صاحب قرآن کو چھوڑ کر یہودیوں کی پیروی کی، ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ انسان اپنا مذہب چھوڑ کر بلاوجہ اور بے غرض بے دینی اختیار نہیں کر سکتا، اور جب کہ ”حق گو“ صاحب کے خیال میں حکومتوں کی سرپرستی میں حدیث وضع کی گئی ہے، اور بادشاہ عموماً عیاش اور شہوت پرست تھے، تو اب تصویر کی حرمت صرف بے وجہ اور بے فائدہ ہی نہیں رہے گی، بلکہ بادشاہ وقت کی عیاشی اور شہوت پرستی کے لئے بے حد مضر بھی ہوگی۔ پس

تعجب ہے کہ ایسی چیز واضعین حدیث نے کیوں وضع کی اور بادشاہوں نے اس سے کیوں نہیں روکا، بالخصوص جب کہ وہ قرآن سے اس کا جواز دکھلا کر واضعین حدیث کے خلاف عوام الناس کے جذبات کو بھی برانگیختہ کر سکتے تھے، اور بزور اس کو روک سکتے تھے، پھر وہ واضعین حدیث بھی کیسے سادہ لوح تھے، کہ انہوں نے قرآن کو بھی چھوڑ دیا، اور اپنے محسنوں اور بادشاہوں کو بھی خوش نہ کر سکے، ''حق گو'' صاحب ہوش میں آؤ اور سوچو کہ ایسی بے عقلی کوئی انسان کیسے کر سکتا ہے، پھر ذرا یہ بھی بتاؤ، کہ جب تمہارے نزدیک گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی بات کے قرآن میں مذکور ہونے سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے، تو تم نے ڈاڑھی کے ان احکام پر جو احادیث میں مذکور ہیں، کیوں طعن کیا، اور اس کو یہودیوں کی تقلید کیوں کہا، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی کا ذکر قرآن میں موجود ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ داڑھی رکھنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے، قرآن میں ہے کہ ''لا تاخذ بلحیتی ولا برأسی'' (یعنی) ''اے بھائی موسیٰ! میری داڑھی اور میرے سر کے بال نہ پکڑو'' اسی طرح قتل مرتد پر کیوں معترض ہوئے، جب کہ مرتدین بنی اسرائیل کی سزا قرآن میں قتل ہی مذکور ہے۔

''حق گو'' کی شرمناک غلط بیانی

اس کے بعد میں ''حق گو'' صاحب کی اس مشق دروغبانی کی داد دوں گا کہ انہوں نے نہایت دلیری سے یہ لکھ دیا کہ:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے پر عقاب کی تصویر بنی ہوئی تھی۔''

کیوں صاحب آپ نے اس جھنڈے کو دیکھا ہے، اگر نہیں دیکھا ہے تو آپ کو کس کے بیان سے معلوم ہوا، اور اس کا بیان آپ تک کس طرح پہنچا، اور آپ نے اس سلسلۂ رواۃ پر کس طرح اعتبار کر لیا، جس کے ذریعہ آپ کو یہ معلوم ہوا ہے، کیا

آپ کو شرم نہیں معلوم ہوتی، کہ روایت کو آپ مردود بھی قرار دیتے ہیں؟ اور پھر اسی سے کام بھی لیتے ہیں۔

پھر اگر کسی روایت میں یہ ذکر ہوتا تو بھی غنیمت تھا، اور اس صورت میں آپ ایک ہی گناہ کے مرتکب ہوتے، (یعنی استدلال بالروایۃ کے) لیکن لطف تو یہ ہے کہ اس روایت ہی کا کہیں وجود نہیں ہے، سیر میں صرف اتنا ہے کہ آپ کے ایک جھنڈے کا نام "رایۃ العقاب" تھا، لیکن یہ کہ اس میں عقاب کی تصویر بنی تھی، "حق گو" صاحب کا اضافہ اور افتراء ہے، اس جھنڈے کا نام "رایۃ العقاب" اس لئے نہیں پڑا تھا کہ اس میں عقاب کی تصویر تھی، بلکہ وہ عقاب کی طرح بلندی میں اڑتا تھا، اور اس پر عقاب کا دھوکا ہوتا تھا، اس لئے "رایۃ العقاب" کہلاتا تھا، اور فتوح البلدان میں مورخ بلاذری نے لکھا ہے کہ عرب لوگ جھنڈے کو عقاب بھی کہتے ہیں۔

ماکول اللحم جانوروں کی بحث

"حق گو" صاحب لکھتے ہیں:

> "یہود میں کھانے پینے کی چیزوں میں بھی مذہب وایمان کا دخل تھا، چنانچہ کتاب تثنیہ میں ماکولات لحم پر ایک بڑی لمبی فہرست دی گئی ہے، قرآن میں خدا نے فرمایا ہے کہ یہودیوں پر یہ حلال وحرام اس لئے تھا کہ اس سے زیادہ کی اہلیت مذہب میں نہ رکھتے تھے، مگر مسلمانوں نے جب یہودیوں کی فہرست دیکھی تو فوراً پنجہ دار جانوروں اور کچلی دار جانوروں کی حرمت کی حدیث وضع ہوگئی۔"

"حق گو" کی قرآن مجید پر تعریض

"حق گو" صاحب نے اس عبارت میں قرآن مجید پر سخت تعریض کی ہے، ان

کے انداز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے پینے میں مذہب وایمان کا دخل نہ ہونا چاہئے، حالانکہ قرآن کریم خود بہت سی چیزوں کو مذہبا حرام وناجائز بناتا ہے، خدا فرماتا ہے ”أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الانعامِ الا ما يتلٰى عليكُمْ“ ”(یعنی) تمہارے لئے سب چوپائے حلال کئے گئے ہیں، مگر وہ جن کی تلاوت آگے کی جائے گی۔“ پھر اس اجمال کی تفصیل یوں کی گئی ”حُرِمَتْ عَلَيْكُمْ الميتة والدَّمُ وَلَحْمُ الخِنْزِيْرِ وما أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ المنخنقة والموقوذة والمتردية والنطيحة وَمَا اكلَ السَّبع الّا ما ذكيتم وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُب“ ”(یعنی) حرام کیا گیا تم پر مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ چیز جس پر غیر خدا کا نام پکارا گیا، اور جو جانور مرا ہو گلا گھٹنے سے اور چوٹ سے اور بلندی سے گر کر اور سینگ مارنے سے اور جس کو کھایا پھاڑنے والے جانور نے، مگر جو تم نے ذبح کر لیا ہو، اور (حرام ہے) جو ذبح کیا گیا ہو کسی تھان پر۔“

اس کے آگے اسی سورہ مائدہ میں شراب کی حرمت بھی مذکور ہے، اب ”حق گو“ صاحب بتائیں کہ مذہب وایمان کا دخل کھانے پینے کی چیزوں میں بھی قرآن سے ثابت ہوا یا نہیں، اور انہوں نے منقولہ بالا عبارت میں قرآن کے صریح احکام کی مخالفت وتکذیب کی یا نہیں؟ ناظرین ”حق گو“ صاحب کی اس عبارت کو پڑھیں، اور ہمارے اس قول کی تصدیق کریں، جس کو ہم نے مقدمہ میں لکھا ہے، کہ انکار حدیث کا منشاء بجز بے دینی اور مذہب سے آزادی حاصل کرنے کے اور کچھ نہیں۔

قرآن مجید پر افتراء

اس کے بعد ہم ”حق گو“ صاحب سے پوچھتے ہیں، کہ قرآن مجید میں یہ کہاں مذکور ہے کہ:

”یہود کے لئے یہ حلال وحرام اس لئے تھا کہ وہ اس سے زیادہ کی اہلیت

مذہب میں نذر کھتے تھے۔“

مہربانی کر کے اس آیت کو نقل کیجئے جس میں فقدان اہلیت کا لفظ ہو، حیرت ہے کہ ”حق گو“ صاحب وضع حدیث کو تو جرم سمجھتے ہیں (اور حقیقۃً ایسا کرنے والا مجرم ہے) لیکن قرآن بنالینا اور خدا پر افتراء کر بیٹھنا، ان کے نزدیک کوئی جرم نہیں ہے؟

بنی اسرائیل پر طیبات کے حرام ہونے کی وجہ

قرآن میں جہاں اس کا ذکر ہے، وہاں کے الفاظ یہ ہیں: ”فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا“ ”(یعنی) یہودیوں کے ظلم ومعصیت کی وجہ سے اور چونکہ وہ خدا کی راہ سے بہتوں کو روک رہے تھے، اس لئے ہم نے ان پر بہت سی پاکیزہ چیزوں کو حرام کر دیا۔“ اور ایک جگہ ہے ”ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ“ ”(یعنی) یہ ان کی سرکشی کا بدلہ تھا، بہرحال جب ان کی سرکشی کی وجہ سے بہت سی کھانے کی چیزیں ان پر خدا نے حرام کیں۔ تو ظاہر ہے کہ مذہب کو کھانے کی چیزوں میں دخل ہوا۔

’حق گو‘ نسخ کا قائل ہو گیا

یہاں پر ”حق گو“ صاحب کو ایک نکتہ سمجھا دینا مناسب ہوگا، ”حق گو“ صاحب اقراری ہیں کہ یہودیوں پر بہت سی کھانے کی چیزیں اللہ نے حرام کیں، اور یہ تحریم ان کی نااہلیت کی وجہ سے تھی، اور ”حق گو“ صاحب اس کا بھی انکار نہیں کر سکتے، بلکہ ان کا عنوان کلام اس کو صاف ظاہر کر رہا ہے کہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ میں وہ چیزیں حرام نہیں ہیں، پس ثابت ہوا کہ ایک چیز کو اللہ تعالیٰ ایک وقت میں کسی مصلحت سے حرام کرتا ہے، اور پھر اسی کو حلال کر دیتا ہے، اور اسی کا نام ہماری اصطلاح میں نسخ ہے، پس ”حق گو“ صاحب خود اپنے اقرار سے نسخ کے قائل ہو گئے، لہٰذا ان کا اس مسئلہ پر طعن کرنا ان کی خبط الحواسی کی دلیل ہے۔

"مثنا" کا صحیح معنی

"حق گو" صاحب نے اس مقام پر فٹ نوٹ میں مثنا کی تحقیق کی ہے، اور اس کو سنت کا مرادف قرار دیا ہے، مگر "حق گو" صاحب کی یہ صریح غلطی یا بالقصد فریب کاری ہے، مثنا کے صحیح معنی "قانون ثانی" یا "ڈیوٹرونومی" کے ہیں، عبرانی زبان کی لغت میں اور یورپین محققین کی تحقیقات سے یہی ثابت ہوتا ہے، تفصیل کے لئے معارف نمبر ۲ جلد ۲۴، اور نمبر ۱ جلد ۲۶ ملاحظہ کیجئے۔

"حق گو" صاحب کی اختلاف بیانی

"حق گو" صاحب نے "مسیحیت و حدیث" کے عنوان کے ماتحت لکھا ہے کہ:

> "مسلمانوں نے ان واقعات کو بھی جو ان کے زمانے میں پیش آئے آثار قیامت میں داخل کر دیا، اور اس مضمون کی حدیث بنالی۔" (صفحہ ۱۷)

اور اس کے بعد ایک حدیث نقل کر کے لکھتے ہیں، کہ:

> "یقیناً یہ قصہ آثار قیامت عبداللہ بن زبیر کی جنگ کا واقعہ ہے۔"

حالانکہ آپ کو یاد ہوگا، کہ وہ لکھ چکے ہیں، کہ:

> "عبداللہ بن زبیر وغیرہ کے واقعات میں سے ایک واقعہ کا بھی اشارہ آثار قیامت کی پیشین گوئیوں میں نہیں ہے۔"

"حق گو" صاحب! بتایئے آپ کا وہ قول صحیح ہے، یا یہ قول؟

"حق گو" کی ایک عجیب کاروائی

اس مقام پر "حق گو" صاحب نے ایک اور عجیب کارروائی کی ہے، اور وہ یہ ہے، کہ حدیث "مُشَارٌ الیہ" پر آپ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ:

"حدیث کا یہ واقعہ ۶۲ھ کا ہے، اور وہ حضرت اُمّ سلمہ کی زبانی نقل کی

گئی ہے، حالانکہ حضرت اُمّ سلمہ کا انتقال ۵۹ھ میں ہو چکا تھا۔"

اس اعتراض کو آپ نے ایسے انداز میں ذکر کیا ہے کہ گویا یہ جناب ہی کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس اعتراض کو نووی نے شرح مسلم میں نقل کیا ہے، اور "حق گو" صاحب نے وہیں سے اس کو سرقہ کیا ہے، پھر دوسری کارروائی یہ کی ہے کہ نووی نے وہیں اس کا نہایت مسکت جواب دے دیا ہے، مگر "حق گو" صاحب نے از راہ غایت "دیانت داری" اس کو نقل نہیں کیا، نووی نے یہ جواب ذکر کیا ہے کہ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال یزید بن معاویہ کے عہد حکومت میں ہوا ہے، نہ کہ ۵۹ھ میں جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا آخری عہد خلافت ہے، اور حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کی یہ تاریخ ابن عبدالبر نے استیعاب میں اور ابوبکر ابی خیثمہ نے ذکر کی ہے، لہٰذا راوی کے اس قول پر کہ یہ حدیث ہم نے حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں سنی، کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں شہیدوں کا ذکر

اس عنوان کے ماتحت "حق گو" صاحب نے اپنی یہ عجیب تحقیق بھی ذکر کی ہے، کہ:

> "قرآن شریف میں خدا کی راہ میں مارے جانے والے کو شہید نہیں کہا گیا۔"

لیکن "حق گو" صاحب کو ہم یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے، کہ قرآن کریم کی اس آیت میں شہداء کے لفظ سے کس جماعت کو مراد لیا گیا ہے "اولٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصّٰلِحِيْنَ" "حق گو" صاحب سے درخواست ہے کہ وہ صدیقین، شہداء اور صالحین تینوں کی تعریفیں فرمائیں، اور بتائیے کہ جماعت شہداء صدیقین و صالحین سے کس وصف میں

ممتاز ہے؟

اختلاف بیانی کی دوسری مثال

اختلاف بیانی کی دوسری مثال یہ ہے کہ ''حق گو'' صاحب نے (صفحہ۴) میں لکھا ہے کہ:

> ''حدیث کی اشاعت عباسیوں کی خلافت میں ہوئی ہے۔''

اور (صفحہ۳۳) میں لکھا ہے کہ:

> ''سلطنت کی ہوا خواہی وسرپرستی وتوجہ نے گویا روایت حدیث کا دروازہ کھول دیا۔''

ان عبارتوں کا مقتضی یہ ہے کہ حدیثوں کے وضع کرنے میں امراء وسلاطین کے جذبات کی رعایت کی گئی ہے، بلکہ ''حق گو'' صاحب نے متعدد جگہ یہ تصریح کی ہے کہ بادشاہوں کے ناروا افعال وحرکات کی تائید کے لئے حدیثیں وضع کی گئیں، پھر اس کے ساتھ ساتھ (صفحہ۱۶) میں حرمت تصویر کی حدیث کا ذکر بھی کرتے ہیں، حالانکہ خود (صفحہ۲۰) میں تصریح کی ہے کہ:

> ''خلفائے عباسی تماثیل وصور میں شریعت کا خیال نہ کرتے تھے، جو ان کو حرام بتاتا تھا، (بتاتی تھی؟)۔''

''حق گو'' صاحب! کیا کسی صحیح الحواس شخص سے ایسی اختلاف بیانی کی توقع کی جا سکتی ہے؟

تیسری مثال

اختلاف بیانی کی تیسری مثال یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کی بحث میں تو ان کی عمر منگنی کے وقت یعنی ۱۰ نبوی میں ۱۶ سال لکھتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ بعثت نبوی کے وقت وہ ۵، ۶ برس کی تھیں، لیکن (صفحہ۲۷) میں لکھتے ہیں کہ:

’’حضرت عائشہ اس وقت پیدا بھی نہ ہوئی تھیں۔‘‘

سچ ہے ’’دروغ گورا حافظہ نباشد۔‘‘

’’حق گو‘‘ صاحب کا انکار حدیث کے باوجود حدیثوں سے استدلال

یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ ’’حق گو‘‘ صاحب حدیث کے منکر ہیں، اور انکار حدیث کے وجوہ واسباب ہی کے بیان میں یہ رسالہ انہوں نے لکھا ہے، اور انتہائی بے باکی اور دریدہ دہنی کے ساتھ حدیثوں پر حملہ کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی جگہ جگہ حدیثوں سے استدلال بھی کرتے جاتے تھے، (صفحہ ۱۴) میں لکھتے ہیں:

> ’’اپنا نکاح خود دو مسلمانوں کی شہادت میں پڑھ سکتا ہے۔‘‘

یہ نکاح کے لئے دو شاہدوں کی شرط حدیثوں کے سوا قرآن میں کہاں مذکور ہے، اور (صفحہ ۱۶) میں لکھتے ہیں:

> ’’خود رسول اللہ کا جھنڈا الرایۃ العقاب کہلاتا تھا۔‘‘

کیا حدیثوں کے علاوہ اور کہیں اس کا بیان ہو سکتا ہے؟

اور (صفحہ ۲۸) میں لکھتے ہیں:

> ’’اور اس کے بعد لوگ ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے، اور اس دوران میں جو وحی نازل ہوئی، اس کو پیچھے رہ جانے والوں نے یادداشت کے طور پر حروف مقطوعات (مقطعات کہیے) لگا کر چھوڑ دیا کہ جب کاتبان وحی واپس آئیں گے تو اس کو اپنی جگہ پر رکھ لیں گے، الخ۔‘‘

اگرچہ یہ پورا بیان ’’حق گو‘‘ صاحب کا طبع زاد فسانہ ہے، لیکن بفرض محال اگر یہ بیان مطابق واقعہ بھی ہو تو کیا سوائے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بیان کے جو راویوں کے سلسلہ

سے کسی مصنف تک پہنچے، کوئی دوسرا ذریعہ اس کے علم کے لئے ہوسکتا ہے؟ اسی طرح کسی سورت کا مکی ہونا اور کسی کا مدنی ہونا بجز حدیث وروایت کے اور کسی طرح معلوم ہوسکتا ہے؟ پھر (صفحہ ۳۰) میں لکھتے ہیں، کہ:

> ”آیت ”ما اٰتاکُمُ الرسُول فخذوہ (الآیۃ)““ اس موقع پر آئی ہے، جب کہ مال غنیمت کی تقسیم پر لوگوں کو آنحضرت سے بدگمانی ہوگئی تھی۔“

آیت کا شان نزول بھی ”حق گو“ صاحب کے دماغ کی ایجاد ہے، لیکن اگر بالفرض ثابت بھی ہو، تو سوائے حدیث وروایت کے اور کونسی صورت اس کے معلوم ہونے کی ہے

وجود منع بادہ اے زاہد چہ کافر نعمتی است
منکر مے بودن و ہمرنگ مستان زیستن!

”حق گو“ تحریف قرآن کا بھی قائل ہے

”حق گو“ صاحب کے زیر نظر رسالہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف حدیثوں ہی کے منکر نہیں ہیں، بلکہ وہ قرآن کو بھی محرف قرار دے کر در پردہ اس کا انکار کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ (صفحہ ۲۸) کی منقولہ بالا عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ حروف مقطعات جو قرآن کریم کی بہتیری سورتوں کے اوائل میں ہیں، منزل من اللہ نہیں ہیں، بلکہ صحابہ نے اپنی طرف سے یادداشت کے لئے ان کو لگادیا ہے، (معاذ اللہ) اسی طرح اسی صفحہ میں ان کا یہ لکھنا کہ:

> ”مدینہ کی لمبی سورتوں میں دو تین سورتیں اکٹھی ہی کردی گئیں۔“

ان کے قائل تحریف ہونے کی واضح دلیل ہے، اس لئے ان کے عنوان کلام سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ مدنی سورتوں کے درمیان میں مکی سورتوں کے رکھنے کو تعلیم و

اشارہ رسول اللہ ﷺ کے مطابق نہیں، بلکہ صحابہ کی ذاتی رائے سے اس کو سمجھتے ہیں، اور (صفحہ ۲۹) میں تو بالکل بے حجاب ہو کر لکھ دیا ہے کہ:

> ”یا تو آیت کو تفسیر میں مدغم کر دیا ہے، اور یا یہ بھی اس قرآن سے لیا گیا ہے، جو محرف نہ ہوا تھا۔“

لیجئے اب تو بلا زحمت استدلال یہ ثابت ہو گیا کہ ”حق گو“ صاحب کے نزدیک جس قرآن کی آج تلاوت کی جاتی ہے، وہ محرف ہے (توبہ توبہ) کہئے! اب تو آپ کو یقین ہو گیا کہ انکار حدیث کا منشا بجز بے دینی والحاد کے اور کچھ نہیں ہے، اب تو آپ نے دیکھ لیا کہ حدیثوں کو موضوع اور بناوٹی کہہ کر بے کار کر دیا گیا، اور قرآن کو محرف قرار دے کر بے اعتبار بنا دیا گیا، اب کیا چیز رہ گئی، جس سے دین و مذہب کے احکام معلوم ہوں، اب جس کا جو جی چاہے کرے، آپ اس کو کسی چیز سے ملزم نہیں کر سکتے۔

مذہبی واسلامی غیرت کا خون

ہم محو حیرت ہیں کہ ”حق گو“ صاحب کی اسلامی غیرت کہاں گئی کہ انہوں نے حفظ ونقل اقوال وافعال نبوی اور تدوین حدیث کو جو مسلمانوں کا بے نظیر کارنامہ تھا، کذب وافتراء قرار دے کر خیر الامم کے دامن عزت کو داغدار تو بنایا ہی تھا، اور امت مسلمہ کے محدثین، فقہاء صوفیہ وزہاد اور اصحاب مغازی وسیر کو یہود ونصاری اور مجوس کا مقلد اور ان کے خیالات کا سرقہ کرنے والا اور کذاب ومفتری اور جابر وظالم اور شہوت پرست بادشاہوں کا ہوا خواہ تو کہا ہی تھا لیکن اس سے بھی دل کی بھڑاس نہ نکلی، اور اس وقت تک ان کو چین نہ آیا جب تک کہ انہوں نے ایک غیر مسلم متعصب اور کور عقل مصنف کا وہ مقالہ اپنی تائید میں نقل نہ کیا جس میں وہ دشمن عقل وخرد لکھتا ہے:

”مانویہ فرقہ کے لوگ بھی مسلمانوں کی طرح پانچ وقت کی نماز پڑھتے

> تھے، اور ہر ایک نماز میں کئی رکعتیں بالکل اسی طرح ہوتی تھیں، جیسے اسلامی شریعت میں، نماز سے پہلے وہ لوگ وضو بھی کرتے تھے، اور سال میں تیس دن کے روزے بھی مسلمانوں کی طرح رکھتے تھے، ان کا یہ طریقہ اسلام سے قبل کا ہے، اور قیاس یہ ہے کہ مکہ کے نبی نے اپنی شریعت میں مانویہ شریعت کا نمونہ اختیار کیا ہو۔“

مسلمانو! للہ انصاف! کیا کوئی معمولی مسلمان بھی اس بے غیرتی و بے حسی کا مرتکب ہو سکتا ہے، کیا کوئی مسلم اس مقولہ کو سننے کی تاب لا سکتا ہے؟ چہ جائیکہ اس سے اپنی کسی بات کی تائید حاصل کرے؟ کیا کوئی مسلمان اپنے نبی اور ان کی شریعت کی یہ توہین گوارا کر سکتا ہے؟

مگر ”حق گو“ صاحب کی غیرت وحمیت کی داد دیجئے کہ وہ اس ناپاک مقولہ کو انتہائی رواداری کے ساتھ تائیداً نقل کرتے ہیں، اور فٹ نوٹ میں صرف اتنا لکھ کر ہر الزام سے سبکدوش ہو جاتے ہیں:

> ”اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ آنحضرت نے کبھی مانویہ فرقہ کے لوگوں کو دیکھا تھا، دوسرے میرا گمان ہے کہ قرآن شریف میں نہ پانچ وقت کی نماز ہے، اور نہ تیس دن کے روزے۔“

مگر ”حق گو“ صاحب! جب آپ یورپین وامریکن مصنفوں کی قیاس آرائیوں اور ان کے تخیلات ہی کو تاریخی شہادتوں سے زیادہ یقینی سمجھتے ہیں، اور ان کے مقابلہ میں اپنے مذہب کے متواترات تک تکذیب و تغلیط کر دیتے ہیں، تو کیا بعید ہے کہ کوئی دشمن اسلام اپنی قیاس آرائی سے مانویہ فرقہ کی ملاقات ثابت کر دے، اس وقت آپ کیا کریں گے، ایک یورپین محقق کی تحقیق کو غلط کہنے کی آپ ہمت نہیں کر سکتے، اس لئے سوائے اس کے کیا چارۂ کار ہوگا کہ کریمر کے خیال کو صحیح مان کر ایمان کو خیرباد کہہ دیں۔ ”اعاذنا اللّٰہ۔“

پانچ نمازوں اور تیس روزوں کا ملحدانہ انکار

یہ میرا صرف قیاس نہیں ہے، بلکہ ”حق گو“ صاحب نے اپنی اس عادت کا رسالہ زیر نظر میں بکثرت مظاہرہ کیا ہے، خود اسی فٹ نوٹ میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ کریمر کی اس تحریر سے مرعوب ہوکر پانچ وقت کی نمازوں اور تیس دن کے روزوں کا کیسا صاف انکار کر دیا، حالانکہ وہ یہ بھی کر سکتے تھے، کہ کریمر کی تکذیب کرتے اور پوچھتے کہ تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے، کہ مانو یہ فرقہ اسلام سے پہلے نماز پنجگانہ پڑھتا تھا، اور روزہ ماہانہ رکھتا تھا، کسی مستند تاریخی شہادت سے اس کو ثابت کرو، اس قسم کے بیانات قیاس آرائی سے بمراحل دور ہیں، مگر ”حق گو“ صاحب سے یہ کہاں ممکن، اور ان کو یہ ہمت کہاں؟ ان کو تو یورپ کی ہر تحقیق پر ایمان لانا ضروری ہے۔

قرآن مجید میں تیس روزں کا حکم

پھر ”حق گو“ صاحب کی اس جرأت کو بھی دیکھئے کہ قرآن میں پانچ نمازوں اور تیس روزوں کے مذکور ہونے کا انکار کر گئے حالانکہ تیس روزوں کا صریح حکم قرآن کی اس آیت میں ہے: ”فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهر فليصمه“ (یعنی) تم میں سے جو شخص ماہ رمضان کو پالے تو اس ماہ کا روزہ رکھے۔“ اللہ اکبر! ایک بے دین و لامذہب کی بات کا تو ”حق گو“ صاحب انکار نہ کر سکے، لیکن قرآن کے صریح حکم کے انکار و تکذیب میں ان کو کچھ تامل نہ ہوا۔ ”انا للہ“

پانچ نمازں کا قرآنی حکم

اسی طرح نمازوں کا ثبوت قرآن کی متعدد آیات میں ہے، مثلاً ”اقم الصَّلٰوة طرفی النَّهارِ وزلفًا مِنَ الَّيل حافظوا على الصَّلٰوت وَالصَّلٰوة الوُسْطٰى

اقم الصلٰوۃ لدلوک الشمس الی غسق اللّیل وقرآن الفجر انّ قرآن الفجر کَانَ مَشْهُوْدًا مِنْ بعد صلٰوۃ العشاء من قبل صلٰوۃ الفجر" آیت نمبر۱ سے ثابت ہے کہ دن کے دو کناروں (ابتداء و انتہاء) میں دو نمازیں اور رات کی ساعتوں میں بھی کچھ نمازیں پڑھنی چاہئیں، لہٰذا کم از کم چار نمازیں تو اسی سے ثابت ہوگئیں، اس کے بعد آیت نمبر۲ کو لیجئے تو اس میں صلوات (کم از کم تین) کا پہلے حکم دے کر صلوٰۃ وسطیٰ کا حکم بھی دیا جاتا ہے، لہٰذا اس سے بھی چار نمازیں ثابت ہوئی، پھر چونکہ اس آیت میں ایک نماز کو وسطیٰ کہا گیا ہے، یعنی بیچ کی درمیانی نماز، اور چار ماننے میں کوئی نماز درمیانی نہیں ہو سکتی، اس لئے پانچ نمازیں ماننی پڑیں گی، اور دو ادھر اور دو ادھر اور بیچ میں ایک درمیانی ہو سکے، پس جب اس آیت سے پانچ نمازیں ثابت ہوئیں تو لامحالہ آیت نمبر۱ میں بھی پانچ ہی مراد ہوں گی، دو دن میں اور تین رات میں اور خود اس آیت میں بھی دن کے لئے طرفین (تثنیہ کا صیغہ جو دو پر بولا جاتا ہے) اور رات کے لئے زلف (جمع کا صیغہ جو کم از کم تین پر بولا جاتا ہے). موجود ہے جس سے نمازوں کا پانچ کی تعداد میں ہونا ظاہر ہوتا ہے، اور آیت نمبر۳ میں آفتاب کے مائل بہ غروب ہونے کے وقت کی نماز (یعنی مغرب) اور نماز فجر کا صریح حکم موجود ہے، اور آیت نمبر۴ میں نماز عشاء کا صاف نام موجود ہے، اور آیت نمبر۵ میں نماز فجر کا صریح ذکر ہے، علاوہ بریں اگر قرآن میں نماز پنجگانہ کا ذکر نہ بھی ہوتا، تو "حق گو" صاحب کے لئے اس الزام سے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی، اس لئے کہ وہ مسلمانوں کے عمل متواتر کو حجت اور قابل عمل مانتے ہیں۔ (دیکھو صفحہ ۳۰) اور ظاہر ہے کہ نماز سے بڑھ کر اور کون سا متواتر عمل ہوگا، لہٰذا یہ تواتر بجائے خود اس کی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پانچ وقت کی نمازیں پڑھیں، اور لوگوں کو اس کی تعلیم فرمائی، پس عمل متواتر کو حجت مانتے ہوئے "حق گو" صاحب کریم کے قول کا کیا جواب دیں گے۔

عمل متواتر اور قول متواتر میں کیا فرق ہے؟

یہاں پہنچ کر میں ''حق گو'' صاحب سے یہ بھی دریافت کروں گا کہ جب تواتر آپ کے نزدیک غلطی سے پاک ہے، تو کیا وجہ ہے کہ عمل متواتر کو تو آپ قابل عمل کہتے ہیں، لیکن قول متواتر کو قابل تسلیم و تصدیق نہیں کہتے، فرض کیجئے کہ پچیس یا پچاس آدمی کہتے ہیں کہ ہم سے حضرت عبداللہ ابن عمر کے مولیٰ نافع (رحمہ اللہ) نے بیان کیا کہ میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فلاں بات بیان کرتے ہوئے سنا تو آپ کہہ دیں گے کہ وہ پچاسوں آدمی جھوٹ بولتے ہیں، اگر کہئے کہ ہاں، تو معلوم ہوا کہ آپ قول متواتر کو تسلیم نہیں کرتے، اور متواتر چیز بھی جھوٹی ہو سکتی ہے، پس متواتر عمل بھی قابل عمل نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ جب قول باوجود تواتر کے جھوٹ ہو سکتا ہے، تو عمل بھی باوجود تواتر کے غلط ہو سکتا ہے اور اگر کوئی فرق ہو تو بیان کیجئے۔

تواتر کی اہمیت

حقیقت یہ ہے کہ منکرین حدیث نے تواتر کی اہمیت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، ورنہ ان کو حدیثوں کا انکار ممکن نہ تھا، حالانکہ اس کو نظر انداز کرنا جیسا کہ میں مقدمہ میں اشارہ کر چکا ہوں، نہایت خطرناک اقدام ہے، عقائد و اعمال مذہبی سے قطع نظر کیجئے، تواتر کو بے اعتبار کہنے کے بعد ان مسکینوں کو اپنا صحیح النسب ہونا اور اپنے والدین کے تعلقات زناشوئی کا جائز و شرعی ثابت کرنا بھی محال ہو جائے گا، جب ہم تواتر کی اس ہمہ گیری پر نظر ڈالتے ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ دنیا کا کوئی انسان اس سے بے نیاز نہیں ہے، اور نہ اس کو اس کے تسلیم کرنے سے چارہ ہے، تو سخت تعجب ہوتا ہے، کہ منکرین حدیث نے حدیثوں کے باب میں کیوں اس کا اعتبار نہیں کیا، آخر اس کی کیا وجہ ہے، کہ اس کا تو یہ لوگ انکار نہیں کرتے کہ:

> "ہندوستان میں گوتم بدھ ایک مصلح گزرا ہے۔"

لیکن اگر یہ کہا جائے کہ:

> "زہری رحمہ اللہ ایک راست باز محدث، امام مالک رحمہ اللہ نہایت دیندار، امام حدیث، اور امام احمد رحمہ اللہ ایک خدا ترس صداقت شعار حافظ حدیث تھے، اور ہزار ہا آدمی گواہ ہیں کہ ان حضرات نے اپنے صدہا استاذوں کی زبانی آنحضرت ﷺ کے جن افعال واقوال کو بیان کرتے سنا، اس کو یاد کیا، اور ایک مجموعہ میں جمع کر دیا۔"

تو ہندوستان کے چند افراد یوں اٹھتے ہیں کہ یہ سب غلط ہے، یہ ساری باتیں بناوٹی ہیں، حالانکہ ان حضرات کے ہزاروں ہم عصروں نے ان کو حدیثیں سنتے، اور ان کو بلا ترمیم واصلاح قلم بند کرتے ہوئے دیکھا، اور ان کی صداقت وراستبازی کی قول وفعل سے گواہی دی، اور وہ ساری شہادتیں آج بھی سفینوں میں موجود ہیں اور سینہ بسینہ بھی نقل ہوتی چلی آتی ہیں، اور کوئی ایک قول بھی سینوں یا سفینوں سے ایسا نہیں ملا جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ یہ حضرات (معاذ اللہ) خود افتراء پرداز تھے، یا دوسرے مفتریوں سے یہ باتیں حاصل کی تھیں پھر ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے بھی "منکرین" یہی کہتے جاتے ہیں کہ حدیثیں موضوع اور بناوٹی ہیں، بلکہ ان کی صداقت وصحت کی ساری شہادتیں بھی فرضی ہیں، بہت اچھا لیکن پھر اس کے ساتھ ہی حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ، حضرت نبی آخر الزمان (علیہم السلام) قرآن، توریت، انجیل اور دنیا کی تمام قدیم کتابوں کا بھی انکار کیجئے، بلکہ اپنے نسب کی صحت وغیرہ کا بھی انکار کیجئے کہ ان تمام امور کے ثبوت کا مدار بھی خبر، شہادت در شہادت اور تواتر ہی پر ہے۔

"حق گو" صاحب کی بیباکانہ غلط بیانیاں

"حق گو" صاحب میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ ان کو غلط بیانی اور صریح دروغ بافی

کرنے میں مطلقاً کوئی عار نہیں معلوم ہوتی، صفحات سابقہ میں ضمناً ایسی مثالیں آپ نے پڑھی ہوں گی، یہاں چند نئی مثالیں لکھی جاتی ہیں۔

❶ (صفحہ ۱۵) میں لکھتے ہیں:

> ”نمرود حضرت ابراہیم کے زمانہ میں تھا ہی نہیں، اس کا زمانہ حضرت نوح کے زمانے سے بھی قبل کا ہے، جیسا کہ توریت سے ظاہر ہوتا ہے۔“

حالانکہ توریت کی کتاب پیدائش باب ۱۰ میں صراحۃً مذکور ہے کہ نمرود حضرت نوح علیہ السلام کا پڑپوتا ہے، اور اس کا نسب نامہ یہ ہے، ① نمرود بن کوش بن حام بن نوح۔

❷ (صفحہ ۲۳) میں لکھتے ہیں:

> ”حضرت ابوحنیفہ...... کو کوئی دس بارہ حدیثوں سے زیادہ کا علم نہ تھا۔“

حالانکہ غیر مطبوعہ کتابوں کو چھوڑ کر صرف مطبوعہ کتابوں سے حضرت سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ کی روایت کی ہوئی صدہا احادیث آج بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔

❸ اسی صفحہ میں لکھتے ہیں:

> ”ابن حنبل کی کتاب موطا کے بعد دوسری کتاب ہے۔“

حالانکہ ابو عبید، اسد بن موسیٰ، سورتی، سعید بن منصور، حمانی، طیالسی، عبدالرزاق وغیرہ (رحمہم اللہ) امام احمد رحمہ اللہ سے پہلے فن حدیث میں کتابیں لکھ چکے تھے۔

❹ (صفحہ ۲۷) میں لکھتے ہیں:

> ”ورقہ بن نوفل غالباً ایک قرضی شخص ہے، جس کا حضرت خدیجہ سے رشتہ نہ کوئی عرب کا نساب جانتا ہے، اور نہ ان کے کسی اولاد کا (الخ)۔“

حالانکہ ورقہ کے حالات نہایت تفصیل سے مورخین نے لکھے ہیں، حافظ ابن

حجر رحمہ اللہ نے اصابہ میں ان کا نسب نامہ یوں ذکر کیا ہے، "ورقہ بن نوفل بن اسد ابن عبدالعزی بن قصی" اور تصریح کی ہے کہ ان کا ذکر طبری، بغوی، ابن قانع اور ابن السکن نے کیا ہے، اور اصابہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زبیر بن بکار نے جو بڑے نساب عالم ہیں، ان کا ذکر کیا ہے۔

⑤ (صفحہ ۳۰) میں لکھتے ہیں:

> "مَا اٰتکم الرسُول (الآیۃ)" "اس وقت آئی جب مال غنیمت کی تقسیم پر لوگوں کو آنحضرت سے بدگمانی ہوئی۔"

حالانکہ یہ شان نزول کسی مفسر نے نہیں ذکر کیا ہے۔

"حق گو" کی کم علمی اور ناواقفیت کی چند مثالیں

"حق گو" صاحب کی بے مائیگی کی بہت سی مثالیں آپ اوپر پڑھ چکے ہیں، اب چند مضحکہ خیز مثالیں ملاحظہ ہوں:

① (صفحہ ۲۳) میں آپ نے ابوبکر قطیعی محدث کو "ابوبکر قطفی" اور ان کو امام احمد رحمہ اللہ کا پوتا لکھا ہے، اگر "حق گو" صاحب نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کی بستان المحدثین" کا مطالعہ بھی کیا ہوتا، تو ایسی بے علمی کا مظاہرہ نہ کرتے، ابوبکر قطیعی رحمہ اللہ کا حضرت ابن حنبل رحمہ اللہ سے کوئی نسبی تعلق نہیں ہے، ان کا نام و نسب یوں ہے، "احمد ابن جعفر بن حمدان" اور ابوبکر کنیت ہے۔

② (صفحہ ۲۴) میں امام بغوی کا زمانہ دسویں صدی ہجری بتایا ہے" حالانکہ ان کی وفات ۵۱۶ھ میں ہوئی ہے۔[1]

③ اسی صفحہ میں صاحب مشکوٰۃ کو بارہویں صدی کا عالم بتایا ہے، حالانکہ وہ آٹھویں صدی کے عالم ہیں، اگر "حق گو" صاحب کی نظر مشکوٰۃ پر بھی ہوتی، تو ایسی جہالت کا ظہور ان کے قلم سے نہ ہوتا، مشکوٰۃ کے آخر میں مصنف نے خود اختتام

---

[1] اکمال ص۴۴

تصنیف کا سال ۲۳۲ھ لکھا ہے۔

❹ اسی صفحہ میں لکھا ہے کہ۔

> ''شافعیوں کے پاس کتاب الام شافعی تھی، گھاٹے میں تھے تو حنفی
> ..... ان کو یقیناً دوسرے اسکول کا ذخیرہ حدیث دیکھ کر رشک ہوتا تھا.....
> کہ وہ بے حدیث کے رہے جاتے ہیں، اس لئے انہوں نے دو چھ
> مجموعے (صحاح ستہ) چن لئے۔''

اس جہالت کو دیکھئے، ابھی لکھ چکے ہیں، کہ مسند احمد ؒ موطا کے بعد دوسری کتاب ہے، حالانکہ امام شافعی ؒ، امام احمد ؒ سے قدیم ہیں، اس لئے ان کی کتاب الام کو دوسرے نمبر پر لکھنا چاہئے تھا۔

امام اعظم ؒ اور امام ابو یوسف حافظ حدیث تھے

دوسری جہالت یہ ہے کہ ''حق گو'' صاحب محدثین احناف سے بالکل بے خبر ہیں، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ ؓ خود حافظ حدیث تھے[1] اسی طرح حضرت امام یوسف ؒ بھی حافظ حدیث تھے۔[2] حضرت امام محمد ؒ کی موطا فن حدیث میں آج بھی موجود ہے، حضرت امام طحاوی حنفی ؒ کی شرح معانی الآثار و شرح مشکل الآثار سے کون ناواقف ہے، امام محمد کی کتاب الآثار وکتاب الحج، اس کے علاوہ مسانید امام اعظم بھی ہر جگہ ملتے ہیں، تیسری جہالت یہ ہے کہ صحاح ستہ کو تنہا حنفیوں کا انتخاب سمجھتے ہیں، حالانکہ اگر وہ مقدمہ مشکوٰۃ بھی پڑھ لیتے تو ایسا نہ سمجھتے۔

❺ اسی صفحہ میں وہ ''کلینی'' کو کتاب کا نام سمجھ رہے ہیں، اور اس کو کافی کے علاوہ کوئی اور چیز خیال کرتے ہیں، اور اس کے مصنف کا نام یعقوب اور اس کو قاہرہ کا ایک یہودی بتاتے ہیں، حالانکہ کتاب کا نام کافی ہے، اور مصنف کا نام محمد بن

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ذہبی

[2] تذکرہ

یعقوب اور کلینی نسبت ہے، کسی کتاب کا نام نہیں ہے۔

صوفیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم پر تہمت

❶ (صفحہ ۲۴) میں لکھتے ہیں:

> ”صوفیوں کے نزدیک بالکل مباح تھا کہ ترغیب و ترہیب کی جعلی حدیثیں رسول اللہ کے نام سے مشہور کی جائیں۔“

حالانکہ صوفیہ کرام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اس الزام سے بالکل پاک ہیں، ”حق گو“ صاحب نے اس مدعا پر جس عبارت سے استدلال کیا ہے، اس میں صوفیوں کا کہیں ذکر نہیں ہے، بلکہ بعض متصوفہ کا ذکر ہے، افسوس ہے کہ ”حق گو“ اپنی نادانی کے باعث ”صوفی“ اور ”متصوف“ میں فرق نہ کر سکے، ”متصوف“ بناوٹی کو کہتے ہیں یعنی ”متصوف“ کا اطلاق اس گروہ کے افراد پر ہوتا ہے، جس کا ذکر انقلاب کے ”افکار و حوادث“ اور زمیندار کے ”فکاہات“ میں اکثر ہوتا رہتا ہے، اور اس گروہ کو کوئی پابند شرع اچھی نظر سے نہیں دیکھتا، اور نہ کوئی اس کو صوفیہ صافیہ کی جماعت میں شمار کرتا ہے، لہٰذا ایسوں کے فعل کی وجہ سے سچے صوفیوں کو بدنام کرنا دیانت کے خلاف ہے، سچے صوفیہ ہرگز اس امر قبیح کے مرتکب نہ تھے، یہ دوسری بات ہے کہ فن حدیث سے ناواقفیت یا حسن ظن کی وجہ سے اپنے کلام میں کوئی موضوع حدیث نادانستہ ذکر کر گئے ہوں۔

❷ (صفحہ ۲۵) میں لکھتے ہیں کہ:

> ”وضع حدیث کے فتنہ کو دبانے کے لئے، جاحظ، ملا قاری، ابن جوزی، عسقلانی، شوکانی، وغیرہ کا گروہ اٹھا۔“

سبحان اللہ! کیا معلومات ہیں، یعنی جاحظ بھی اس فتنہ کو دبانے اٹھے تھے؟ اور چھٹی صدی ہجری تک جو ابن جوزی کا زمانہ ہے، کوئی اس فتنہ کو فرو کرنے کے لئے

اٹھائی نہ تھا۔

صوفیائے کرام کی دشمنی میں قرآن کا انکار

⑧ (صفحہ ۲۶) میں لکھتے ہیں کہ:

> "صوفیوں نے رسول اللہ کو اپنے رنگ میں رنگنا شروع کیا مہینوں صوم وصال رکھوائے، بھوکوں کی شدت سے ان کے پیٹ پر پتھر بندھوائے، ازواج مطہرات کو ایک جوڑے کپڑے اور ایک کھجور پر قناعت کرائی الخ۔"

اس سے زیادہ بے علمی اور کیا ہوگی کہ "حق گو" صاحب قرآن کے مضامین سے ایک دم نابلد ہیں، قرآن کریم میں خدا نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو خطاب کر کے فرمایا ہے: "ولنبلونكم بشيءٍ من الخوفِ والجُوع ونقصٍ مِّنَ الاموال والانفسِ والثمراتِ وبشر الصّابرِيْنَ" اور سورہ احزاب میں اپنے محبوب نبی ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اپنی ازواج مطہرات سے کہہ دیجئے "ان كنتن تردن الحيوة الدنيا وزينتها فتعالين امتعكن واسرحكن سراحًا جميلًا" اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات دنیا کی آسائش اور مآکل وملابس کی فراوانی سے محروم تھیں۔

چونکہ میری یہ تحریر توقع سے زیادہ طویل ہوگئی ہے، اس لئے اب صرف ایک بات اور ذکر کر کے اس کو ختم کرتا ہوں۔

موضوعات کی اشاعت کے خلاف حضرات محدثین اور خلفاء کی مساعی جمیلہ

"حق گو" صاحب نے اپنے رسالہ کے متعدد مقامات میں یہ ظاہر کیا ہے کہ محدثین نے بناوٹی حدیثیں شائع کیں، اور خلفاء نے ان کی سرپرستی کی، حالانکہ یہ

بالکل بے بنیاد بلکہ تاریخی شہادتوں کے خلاف بات ہے، اب موقع نہیں ہے، ورنہ تفصیل وار بتایا جاتا کہ کن کن محدثین اور خلفاء نے فتنۂ وضع حدیث کو دبانے کے لئے کیا کیا کوششیں کیں، اور کس کس محدث نے موضوعات کو صحیح احادیث سے علیحدہ کرنے کے لئے کیا کیا خدمت انجام دی، اس لئے صرف دو چار تاریخی واقعات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

❶ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ:

> ''مہدی عباسی کو (جس کی خلافت کا زمانہ ۱۵۸ھ سے ۱۶۹ھ تک ہے) کبوتروں کا بڑا شوق تھا، ایک دن غیاث بن ابراہیم نامی ایک شخص دربار میں آیا، لوگوں نے اس سے فرمائش کی کہ امیر المؤمنین کو حدیث سناؤ، اس نے کہا حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً مروی ہے، کہ کھر والے اور موزے پہننے والے (یعنی اونٹ) جانوروں اور تیروں اور ڈینے والے جانوروں کے سوا اور کسی چیز میں مقابلہ جائز نہیں ہے، مہدی نے اس کو کچھ انعام دیا، اور جب جانے لگا تو کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو جھوٹا ہے تو نے روپے کے لئے ''ڈینے والے جانوروں'' کا اضافہ کر دیا ہے، تاکہ کبوتروں کا مقابلہ (کبوتر بازی) بھی جائز ہو جائے، اور اس کے بعد حکم دیا کہ تمام کبوتر ذبح کر دیئے جائیں، حکم کی دیر تھی، سارے شاہی کبوتر آن کی آن میں ذبح کر دیے گئے۔''

❷ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے موضوعات کبیر کے دیباچہ میں اور سیوطی رحمہ اللہ نے تاریخ الخلفاء میں ابن عساکر رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ:

> ''ہارون الرشید خلیفہ عباسی (جس نے ۱۷۰ھ سے ۱۹۳ھ تک فرائض خلافت انجام دیے ہیں) کے پاس ایک بے دین لایا گیا، ہارون نے اس کے قتل کا حکم سنایا، اس نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! آپ ان چار

ہزار حدیثوں کو کیا کریں گے، جن کو میں نے بنایا ہے، ان میں کا ایک حرف بھی آنحضرت (ﷺ) کا فرمودہ نہیں ہے، ہارون نے اس کے جواب میں کہا کہ تجھ کو عبداللہ بن المبارک اور ابو اسحق فزاری کی بھی خبر ہے، وہ دونوں حضرات حدیثوں کی چھان بین کر رہے ہیں، اور وہ موضوعات کا ایک ایک حرف نکال کر پھینک دیں گے۔

③ زمانہ حال کے شہرہ آفاق مورخ مولانا شبلی صاحب نعمانی لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر فخر کا موقع حاصل رہے گا، کہ ان کا قلم تلوار سے نہیں دبا...... ایک دفعہ ایک شاعر نے مامون الرشید کے دربار میں قصیدہ پڑھا کہ امیر المؤمنین! اگر تو آنحضرت (ﷺ) کے انتقال کے وقت موجود ہوتا، تو خلافت کا جھگڑا سرے سے نہ پیدا ہوتا، دونوں فریق تیرے ہاتھ پر بیعت کر لیتے، وہیں سر دربار ایک شخص نے اٹھ کر کہا تو جھوٹ کہتا ہے، امیر المؤمنین کے باپ حضرت عباس ؓ جو عباسیوں کے مورث اعلیٰ ہیں، وہاں موجود تھے، ان کو کس نے پوچھا، مامون الرشید کو بھی اس گستاخانہ لیکن سچ جواب کی تحسین کرنی پڑی۔"

④ ذہبی کی میزان الاعتدال میں ہے کہ:

"ابن حبان محدث ؒ نے ایک شخص کو مکہ میں ایک موضوع حدیث بیان کرتے ہوئے دیکھ کر کہا کہ اے بڈھے! اللہ سے ڈر، اور رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ نہ باندھ، پہلے تو وہ نہ مانا، لیکن جب ابن حبان نے اس کو بادشاہ کا خوف دلایا، تو اس نے قسم کھائی کہ اب مکہ میں حدیث نہ بیان کروں گا۔"

اس قسم کے صدہا واقعات تاریخوں میں مذکور ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے، کہ محدثین بھی بادشاہوں کی خوشامد میں کوئی حدیث بنانا تو درکنار کسی خوشامدی کی ایک

حرکت دیکھ کر خاموش بھی نہیں رہے، فوراً بادشاہ کے منہ پر اس کے جھوٹ ہونے کا اعلان کر دیا، اور اسی پر منحصر نہیں، انہوں نے سلاطین کے کسی ناروا فعل کی خاموشی سے بھی حمایت نہ کی، سعید بن جبیر ؒ اور حجاج، امام اوزاعی اور سفاح، امام ابو حنیفہ ؒ اور ابن ہبیرہ و منصور اور امام احمد اور معتصم کے واقعات میرے دعویٰ کی پرزور شہادتیں ہیں۔

''حق گو'' صاحب نہایت دیدہ دلیری سے یہ بھی لکھ جاتے ہیں، کہ مؤطا کی تصنیف حکومت کی سرپرستی میں ہوئی، حالانکہ تاریخوں سے ثابت ہے کہ منصور عباسی حاکم وقت کے خلاف علویوں کا گروہ تھا، اور امام مالک ؒ نے علویوں کی موافقت کی تھی، اور منصور کے خلاف خروج کا فتویٰ دیا تھا، ایسی حالت میں منصور مؤطا کی سرپرستی کیسے کر سکتا تھا، امام مالک ؒ کے علاوہ سفیان ؒ و ابن عجلان ؒ اور دوسرے محدثین پر بھی حکومت نے یہ الزام قائم کیا تھا، اور ان کی گرفتاری کا حکم دے رکھا تھا، علاوہ بریں محدثین وفقہاء، امراء وحکام کی ہم نشینی کو نہایت نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اس حالت میں ان سے حکومتوں کو اور حکومتوں سے ان کو کیا توقع ہو سکتی تھی!؟ اور ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی حمایت کیونکر کر سکتا تھا؟ تطویل کے خیال سے اشارات پر اقتصار کرتا ہوں، اور ''حق گو'' صاحب چاہیں گے تو کسی صحبت میں مورخین کی تصریحات بہ تفصیل پیش کی جائیں گی۔

ایڈیٹر اہل حدیث امرتسر سے ایک شکایت

''حق گو'' صاحب سے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا، اب سب سے آخر میں مجھے مولوی ثناء اللہ صاحب (ایڈیٹر اہل حدیث سے ایک شکایت کرنی ہے) مجھے نہایت تعجب ہوا جب میں نے دیکھا کہ منکرین حدیث کو یہ رسالہ ثنائی برقی پریس میں طبع ہوا ہے، اور میں نہیں سمجھ سکا کہ مولوی ثناء اللہ صاحب نے بایں ہمہ ادعائے عشق

حدیث دشمنان حدیث کے اس الحاد پرور رسالہ کو جس میں حدیث اور محدثین کی تنقیص وتکذیب اور توہین وتحقیر کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا ہے، کیوں اپنے پریس میں طبع کرایا، اور ان کی مذہبی حمیت وغیرت نے اس کو کس طرح گوارا کرلیا، کیا مولوی صاحب مجھے بتائیں گے کہ یہ تعاون ”علی الاثم والعدوان“ میں داخل ہے یا نہیں، اور کیا حدیث میں دشمنوں کے ہاتھ اسلحہ بیچنے کی ممانعت آئی ہے، یا نہیں، اگر آئی ہے تو اس میں کیا راز ہے؟ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس رسالہ کو چھاپ کر آپ خاموش ہوگئے جہاں تک مجھے معلوم ہے، آپ نے مستقل جواب تو درکنار اپنے اخبار میں بھی شاید اس کی خبر نہیں لی۔

مولوی صاحب! گستاخی معاف! ”اہل حدیث“ کہلانے کے لئے تو آپ ہیں، اور حدیثوں سے مدافعت کرنے کے لئے حنفی ۔

فاذا تكون كريهة ادعى لها
واذا يحاس الحيس يدعى جندب

”(مطلب یہ کہ) جب کوئی سختی پیش آتی ہے، تو اس کے لئے میں بلایا جاتا ہوں، اور جب حلوا پکتا ہے، تو جندب (ایک شخص کا نام ہے) کو بلایا جاتا ہے۔“

هذا آخر الكلام والحمد لله الكريم المنعام وصلى الله على سيدنا محمد خير الانام واله وصحبه الغر الكرام۔

* * *